

قرآن مجید میں مُعَرَّبٌ^(۱)

ڈاکٹر سراج الاسلام حنیف*

ABSTRACT

It is an interesting fact that there is a number of words in the Qur'an which root is not Arabic. Although it has been a controversial issue among the scholars whether the Holy Qur'an includes any word from other languages or not, the existence of such type of words is admitted generally. The resent article touches in short this controversy and supports in detail the view of existence of such type of words in the Holy text.

اہل عرب پر اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت و عنایت ہے کہ اُس نے قرآن مجید کو عربی زبان میں اُتارا تاکہ اُن کو اس کلام کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے، اس لیے اُس نے یہ اعلان فرمایا کہ: ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾^(۲) (ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اُتارا تاکہ تم سمجھو۔) یہ خطاب اہل عرب سے عموماً اور قریش سے خاص طور پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تم پر عظیم احسان ہوا ہے کہ اُس کی یہ سب سے بڑی نعمت تمہاری عربی زبان میں نازل ہوئی ہے تاکہ تم اس کو سمجھو، اس کی قدر کرو اور اس کو دوسروں تک پہنچاؤ اور اُن کو سمجھاؤ۔ یہ اس کتاب کے کتاب مبین ہونے کا ایک پہلو ہے اور اس میں قریش کے لیے ایک دھمکی بھی ہے کہ اگر تم نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو تم سے بڑا بد قسمت بھی کوئی اور نہ ہوگا، یہ جتنی بڑی نعمت ہے، ناقدری کی صورت

۱- اسم صفت ہے، وہ لفظ جسے عربی بنایا گیا ہو اور دراصل وہ لفظ کسی دوسری زبان کا ہو۔

* اسٹنٹ پروفیسر، عبد الولی خان یونیورسٹی، مردان (sirajulislam@awkum.edu.pk)

۲- یوسف: ۲

میں اتنی بڑی مصیبت کے مستحق ٹھہرے۔ ﴿كِنْدُبٌ فُصِّلَتْ ءَايَاتُهُ، قُرْءَانًا عَرَبِيًّا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ﴾^(۳) (یہ ایسی کتاب ہے کہ اس کی تفصیل عربی قرآن کی صورت میں ان لوگوں کے لیے کی گئی ہے جو جاننا چاہیں۔) ﴿إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْءَانًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾^(۴) (ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اتارا ہے تاکہ تم سمجھو۔)

قرآن مجید کا عربی میں اتارا جانا اہل عرب پر ایک عظیم احسان بھی تھا اور ایک فیصلہ کن اتمامِ حجت بھی۔ احسان کا پہلو تو بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری اور کامل ہدایت ان کی زبان میں اتاری کہ وہ بلا واسطہ غیر اس سے کسبِ فیض کر سکیں، دوسروں کی تعلیم و تبلیغ کا انھیں رہنِ احسان نہ ہونا پڑے، بلکہ دوسرے ان کے زیرِ احسان بنیں۔ اتمامِ حجت کا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اپنی زبان میں اپنی ہدایت نازل کر کے ان کا ہر عذر ختم کر دیا ہے اور اب وہ عند اللہ یہ عذر نہیں کر سکتے کہ مخاطب عربی اور کلامِ عجمی! ﴿وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْءَانًا عَجَمِيًّا لَقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ ءَايَاتُهُ ءَأَعْجَمِيٌّ وَعَرَبِيٌّ﴾^(۵) (اور اگر ہم اس قرآن کو عجمی قرآن کی شکل میں اتارتے تو یہ لوگ یہ اعتراض اٹھاتے کہ اس کی آیات کی وضاحت کیوں نہیں کی گئی! کلامِ عجمی اور مخاطب عربی!)

قرآن مجید سے اعراض و فرار کے یہود مختلف بہانے پیدا کرتے تھے، جن میں سے بعض کو سورۃ حم السجدة میں نقل کر کے ان کی لغویت واضح کی گئی ہے۔ اہل کتاب جو بنو اسماعیل کو قرآن مجید کی نعمت سے محروم کرنا چاہتے تھے یہ اعتراضات مشرکین مکہ کو بھی سکھایا کرتے تھے اور قریش کے نادان لیڈر ان کے حسد اور ان کی چالوں سے بے خبر ہونے کے باعث محض رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کے جوش میں ان کے بتائے ہوئے شبہات و اعتراضات نقل کرنا شروع کر دیتے تھے۔ یہود کے سکھائے ہوئے متعدد اعتراضات میں سے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ وحی کی مخصوص زبان تو اب تک عبرانی رہی ہے، جس میں وہ تمام صحیفے نازل ہوئے جن کے آسمانی ہونے کا اقرار قرآن مجید کو بھی ہے تو اب اللہ تعالیٰ نے اپنی زبان کیوں بدل لی اور یہ نئی وحی عربی میں کیوں نازل ہوئی؟ قرآن مجید نے اس کا جواب یہ دیا کہ ان لوگوں کا یہ اعتراض محض برائے اعتراض اور قرآن مجید کی مخالفت کے لیے ایک بہانہ ہے۔ اگر قرآن مجید کسی عجمی زبان میں اترا تو یہی لوگ یہ اعتراض اٹھاتے کہ اس کی آیتوں کی ہماری زبان

۳ - فصلت: ۳

۴ - الزخرف: ۳

۵ - فصلت: ۴۴

میں اچھی طرح وضاحت کیوں نہیں کی گئی، لیکن جب ہم نے قرآن مجید کو عربی زبان میں اُتار کر اُن کے لیے اچھی طرح کھول دیا تو بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل و احسان کے شکر گزار ہوتے، دشمنوں کا سکھایا ہوا یہ اعتراض لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے سابق روایت کے خلاف اپنی یہ وحی عربی زبان میں کیوں اُتاری، گویا اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم احسان ان نادانوں کے لیے وجہ اعتراض بن گیا۔ اَعْجَبُ وَعَرَبِيٌّ وَالْاَفْتَرُ اُن کے اعتراض ہی کا حصہ ہے کہ اس وقت یہ لوگ یہ بات بناتے کہ پیغام عجمی اور مخاطب عربی!! یعنی یہ کیا بے تکاپن ہے کہ جو لوگ اس کتاب کے سب سے پہلے مخاطب ہیں وہ اس کی زبان سے بالکل نابلد ہیں!!

قرآن مجید میں معرَب؟

قرآن مجید میں مُعَرَّبُ الفَظ کے وقوع میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ زیادہ تر ائمہ جن میں امام شافعی، مفسر ابن جریر، قاضی ابو بکر اور ابن فارس بھی شریک ہیں، ان کی رائے ہے کہ قرآن مجید میں عربی زبان سے باہر کا کوئی لفظ واقع نہیں ہوا ہے اور وہ اس کی دلیل میں یہ آیات پیش کرتے ہیں:

☆ ﴿ اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ قُرْءَانًا عَرَبِيًّا ۗ ﴾^(۱) (ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اُتارا۔)

☆ ﴿ اِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْءَانًا عَرَبِيًّا ۗ ﴾^(۲) (ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اُتارا ہے تاکہ تم سمجھو۔)

اس سوال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ: ”بأن الكلمات اليسيرة بغير العربية لا تخرج عن

كونه عربياً والقصيدة الفارسية لا تخرج عنها بلفظة فيها عربية.“^(۸) (تمام قرآن مجید عربی الفاظ سے بھر اڑا ہے اس لیے اس میں معدودے چند غیر زبانوں کے الفاظ کا آجانا اسے عربی کلام ہونے سے خارج نہیں بنا سکتا۔ ایک فارسی قصیدہ جس میں دو ایک عربی لفظ آئے ہوں فارسی ہی کہلائے گا اور ان چند لفظوں کی وجہ سے عربی قصیدہ نہ ہو جائے گا۔)

-۶- يوسف: ۲

-۷- الزخرف: ۳

-۸- عبد الرحمن بن ابوبکر، جلال الدین سیوطی، الإنقان في علوم القرآن، ت: محمد ابو الفضل ابراہیم، مصر، الهيئة المصرية

☆ ﴿وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْءَانًا عَجَمِيًّا لَقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ آيَاتُهُ ۖ أَعْرَبِيٌّ وَعَرَبِيٌّ﴾^(۹) (اور اگر ہم اس قرآن کو عجمی قرآن کی شکل میں اتارتے تو یہ لوگ یہ اعتراض اٹھاتے کہ اس کی آیات کی وضاحت کیوں نہیں کی گئی! کلام عجمی اور مخاطب عربی!)

اس سوال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ: بأن المعنى من السياق: ”أكلام أعجمي ومخاطب

عربي؟“^(۱۰) (یہاں سیاق کلام سے یہ معنی بنتے ہیں کہ آیا کلام تو عجمی ہے اور اس کا مخاطب عربی ہو؟)

ابو عبیدہ اس بات کے سختی سے منکر ہیں کہ قرآن مجید میں کوئی مُعَرَّب ہو، چنانچہ ابو منصور جو الیقینی نے اُن کے حوالے سے لکھا ہے: ”من زعم أن في القرآن لسانًا سوى العربية فقد أعظم على الله القول، واحتج بقوله تعالى: ﴿إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْءَانًا عَرَبِيًّا﴾“^(۱۱) (جس کا خیال ہو کہ قرآن مجید میں عربی کے سوا دوسری زبانوں کے حروف پائے جاتے ہیں، تو بے شک اُس نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں نہایت بڑی بات کی ہے، اس لیے کہ قرآن مجید میں ہے کہ ہم نے اس کو قرآن عربی بنایا ہے۔) لیکن ابو عبیدہ کہتے ہیں: ”وروي عن ابن عباس ومجاهد وعكرمة وغيرهم في أحرف كثيرة أنه من غير لسان العرب مثل سجيل والمشكاة واليم والطور وأباريق وغير ذلك.“^(۱۲) (سیدنا ابن عباس، مجاہد و عکرمہ اور اُن کے علاوہ دوسرے علماء سے قرآن مجید کے بہت سے الفاظ کے بارے میں منقول ہے کہ اُن کی اصل عربی نہیں، جیسے: سَجِيلٌ، مِشْكَاةٌ، يَمٌ، طُورٌ اور أباريق وغيرہ۔)

جو الیقینی اور اُن کے حوالے سے حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں:

۹- فصلت: ۴۴

۱۰- سیوطی، مرجع سابق، ج ۲، ص ۱۲۶

۱۱- الزخرف: ۳؛ موهوب بن احمد جو الیقینی، کتاب المُعَرَّب من الكلام على حروف المعجم، ت: ف، عبد الرحيم،

دمشق، دار العلم، ۱۴۱۰ھ-۱۹۹۰ء، ص ۹۲؛ ابو الفرج جمال الدين ابن جوزي، فنون الأفتان في عجائب علوم

القرآن، بيروت، دار الكتاب العربي، ۱۴۲۶ھ- ۲۰۰۵ء، ص ۱۱۵؛ بدر الدين محمد بن عبد الله زركشي، البرهان في

علوم القرآن، ت: محمد ابوالفضل ابراهيم، بيروت، دار المعرفة، ۱۳۹۱ء، ج ۱، ص ۲۸۷

۱۲- جو الیقینی، مصدر سابق، ص ۹۲؛ ابن جوزي، مصدر سابق، ص ۱۱۵

فہو لاء أعلم بالتأويل من أبي عبيدة، ولكنهم ذهبوا إلى مذهب، وذهب هذا إلى غيره، وكلاهما مصيبٌ إن شاء الله، وذلك أن هذه الحروف بغير لسان العرب في الأصل فقلوا أولئك على الأصل، ثم لفظت به العرب بألسنتها فعرّبته فصارعريباً بتعريبها إيّاه، فهي عربية في الحال، أعجمية الأصل، فهذا القول يصدق الفريقين جميعاً.^(۱۳)

یہ سارے (سیدنا ابن عباس، مجاہد اور عکرمہ) ابو عبیدہ کی بہ نسبت تفسیر قرآن کے زیادہ جاننے والے ہیں، لیکن ان کا مسلک الگ ہے اور ابو عبیدہ کا الگ، اور میرے نزدیک ان شاء اللہ دونوں قول درست ہیں۔ ان دو بظاہر متضاد اقوال میں تطبیق اس طرح ممکن ہے کہ دراصل بعض حروف غیر عربی ہیں، پھر آپس میں میل جول ہونے کے بعد یہ الفاظ عربی زبان میں درآئے اور عربوں نے ان پر تکلم شروع کیا اور انہیں اتنی کثرت سے استعمال کیا کہ یہ عربی بن گئے، جو فی الحال تو عربی کے الفاظ ہیں مگر اصل میں دوسری زبانوں کے ہیں، اس قول سے دونوں آرا کی آپس میں تطبیق ہو سکتی ہے۔

ابو عبیدہ قاسم بن سلام فرماتے ہیں:

والصواب عندي مذهب فيه تصديق القولين جميعاً وذلك أن هذه الأحرف أصولها أعجمية كما قال الفقهاء ولكنها وقعت للعرب فعرّبتها بألسنتها وحوّلتها عن ألفاظ العجم إلى ألفاظها فصارت عربية، ثم نزل القرآن وقد اختلطت هذه الحروف بكلام العرب، فمن قال: إنها عربية فهو صادق، ومن قال: عجمية فصادقٌ ومالٌ إلى هذا القول الجواليقي وابن الجوزي وآخرون.^(۱۴)

میرے نزدیک وہ رائے درست ہے جس میں دونوں اقوال کی تصدیق ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ علما کے حسب بیان، ان الفاظ کی اصل عجمی زبانیں ہیں مگر بات یہ ہوئی کہ اہل عرب کو ان کلمات کے استعمال کی ضرورت پڑھیں انھوں نے ان کلمات کو معرّب بنا کر اپنی زبان سے ادا کرنے کے قابل بنایا، پھر عجمی الفاظ کی صورت سے ان کی صورت بھی بدل کر انہیں اپنی زبان کے الفاظ سے مشابہ بنا لیا اور اسی طرح یہ کلمات عربی زبان کے جز ہو گئے، چنانچہ جس وقت قرآن مجید کا نزول ہوا ہے اُس وقت یہ الفاظ عربی کلام میں ایسے مل جل گئے تھے کہ ان کا امتیاز کرنا مشکل تھا، لہذا اس لحاظ سے جو لوگ ان کو عربی زبان میں شامل بتاتے ہیں وہ بھی اور جو لوگ ان کلمات کو عجمی

۱۳- جوالیقی، مصدر سابق، ص ۹۲؛ ابن جوزی، مصدر سابق، ص ۱۱۵

۱۴- زرکشی، مصدر سابق، ج ۱، ص ۲۹، نوع ۱۷؛ جلال الدین عبدالرحمن سیوطی، الإقتان في علوم القرآن، مصر، مطبعة

المصطفى البابی الحلبي، ۱۳۹۸ھ - ۱۹۷۸ء، ج ۱، ص ۱۷۹-۱۸۰، نوع ۳۸؛ محمد مرتضیٰ زبیدی، تاج العروس،

بیروت، منشورات مكتبة الحياة، بدون تاریخ، ج ۱، ص ۹۰، مقدمہ

قرار دیتے ہیں وہ بھی، دونوں بجائے خود سچے ہیں۔ جو ایتقی، ابن جوزی اور بہت سے دیگر علماء بھی اس قول کی طرف مائل ہیں۔

اس فن میں لکھنے والے

جو ایتقی:

موہوب بن احمد بن محمد بن خضر بن حسن بن منصور جو ایتقی۔ ۴۶۶ھ - ۵۳۰ھ کو بغداد میں پیدا ہوئے۔ ادب و لغت کے بہت بڑے عالم تھے۔ معتقی باللہ عباسی کے امام تھے۔ معتقی باللہ نے اُن سے کچھ کتابیں بھی پڑھی ہیں۔ بوریاں بنانے اور بیچنے والے کو فارسی میں گووال کہتے ہیں، جسے عربی میں جَوَالِقُ کی شکل دے دی گئی اور آپ اسی کاروبار کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ آپ مدرسہ نظامیہ میں اپنے استاد اور علم الألسنة کے شعبے کے صدر، تبریزی کے دوسرے جانشین ہوئے۔ کچے سُنی حنبلی تھے اور انھیں علی بن زید کی جگہ، جو حد سے زیادہ بدنام شیعہ تھا اور جس سے زبردستی استعفا دلوا یا گیا تھا، مقرر کیا گیا۔ جو ایتقی نہایت فرض شناس معلم تھے اور سوالات کے جواب بہت احتیاط کے ساتھ سوچ سمجھ کر دیتے تھے۔ اُن کی خوش نویسی کی بہت تعریف کی جاتی تھی۔ اُن کی تصانیف اس بنا پر تبریزی کی تصانیف کی ہم پلہ سمجھی جانے کی مستحق ہیں کہ انھوں نے عربی زبان کا صحافتی درجہ اس پستی سے، جس میں وہ سلجوقیوں کے زمانے میں جا پڑی تھی، نکال کر بلند کیا۔ آپ نے ۵۴۰ھ - ۱۱۴۵ھ کو بغداد میں وفات پائی۔^(۱۵)

ہمارے اس موضوع سے متعلق اُن کی تصنیف کا نام كِتَابُ الْمُعَرَّبِ مِنَ الْكَلَامِ الْعَجْمِيِّ عَلَي حُرُوفِ الْمُعْجَمِ ہے، جو ڈاکٹر ف، عبدالرحیم کی تحقیق کے ساتھ دار القلم دمشق نے ۱۴۱۰ھ - ۱۹۹۰ء کو پہلی

۱۵- شہاب الدین ابو عبد اللہ یا قوت بن عبد اللہ حوی رومی بغدادی، معجم الأدباء، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ۱۳۹۹ھ - ۱۹۷۹ء، ج ۱۹، ص ۲۰۵؛ ابو العباس شمس الدین احمد بن ابی بکر خلکان، وفيات الأعیان و أنباء أنباء الزمان، ت: ڈاکٹر احسان عباس، قم - ایران، منشورات الرضی، ۱۳۳۶ھ، ج ۵، ص ۳۴۲؛ ابن عماد شہاب الدین ابو الفلاح عبدالحی بن احمد بن محمد عکری حنبلی دمشقی، شذرات الذهب فی أخبار من ذهب، بیروت، دار ابن کثیر، ۱۴۰۶ھ -

بارشائع کی ہے۔ کتاب میں اُن ۳۲ عجیبی الفاظ سے بحث کی گئی ہے، جنہیں عربی زبان نے قبول کر کے عربی بنا دیا، یہ کتاب ۶۷۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

ابن جوزی

عبد الرحمن بن علی بن محمد الجوزی ابو الفرج (۵۰۸ھ-۵۹۷ھ/۱۱۱۳ء-۱۲۰۱ء) تاریخ و حدیث کے جلیل القدر عالم اور کثیر التصانیف مصنف ہیں، ولادت اور وفات بغداد میں ہوئی۔^(۱۶) حافظ صاحب موصوف بہت تیز فہم شخص تھے، چنانچہ جب اُن کے ایک استاد ابن زانونی (وفات: ۵۲۷ھ) نے وفات پائی تو انھوں نے استاذ کی مسند وعظ و تذکیر پر متمکن ہونا چاہا، لیکن نو عمری کی وجہ سے یہ شرف انھیں حاصل نہ ہو سکا، مگر اس کے بعد جب لوگوں نے اُن کے وعظ کا نمونہ دیکھا تو انھیں جامع المنصور میں وعظ کرنے کی اجازت مل گئی۔ اب ابن جوزی نے اپنی تحصیل علم کی سعی کو پہلے سے زیادہ تیز کر دیا، چوں کہ اُن کے نزدیک سب سے اچھی نافلہ عبادت تحصیل علم تھی، اس لیے ہر طرف چنناں مائل نہ تھے، بلکہ کھانے پینے اور خصوصاً ایسی غذاؤں کا اہتمام کرتے تھے جن سے قوت حافظہ قوی ہو اور لباس پر بھی خاص توجہ دیتے تھے۔^(۱۷) حافظ ابن جوزی نے اپنی کتاب فنون الأفتان میں کہا ہے کہ انھوں نے یہ علم اپنے استاد جو الیقینی سے حاصل کیا ہے، چنانچہ ذکر اللغات فی القرآن کے عنوان کے تحت معرب سے بحث کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے: ”فہذہ جملة ما قرأنا علی شیخنا أبی منصور وهو کل ما ذکرہ فی کتابہ المعرب.“^(۱۸) (یہ سارے کے سارے وہ حروف ہیں جو ہم نے اپنے استاذ ابو منصور سے سنے ہیں اور ان سب کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب المعرب میں بھی کیا ہے۔)

حافظ ذہبی نے موفق عبد اللطیف کے حوالے سے لکھا ہے:

قرأت بخط محمد بن عبد الجلیل الموقانی: أن ابن الجوزي شرب البلاذر، فسقطت لحيته، فكانت قصيرة جدا، وكان يخبثها بالسواد إلى أن مات. قال: وكان كثير الغلط فيما يصنفه، فإنه كان

۱۶- خير الدين زركلي، الأعلام، بيروت، دار العلم للملايين، ط ۱۵، ۲۰۰۲ء، ج ۳، ص ۳۱۶

۱۷- شمس الدين محمد بن احمد بن عثمان ذہبی، سير أعلام النبلاء، بيروت، مؤسسة الرسالة، ۱۴۱۰ھ- ۱۹۹۰ء، ج ۲، ص ۳۶۵

۱۸- ابن جوزی، فنون الأفتان، ص ۱۱۶

يفرخ من الكتاب ولا يعتبره. قلت: هكذا هو له أو هام وألوان من ترك المراجعة، وأخذ العلم من صحف، وصنف شيئاً لو عاش عمراً ثانياً، لما لحق أن يحمره ويتقنه. (۱۹)

میں نے محمد بن عبدالجلیل کے خط میں لکھا ہوا پڑھا ہے کہ ابن جوزی نے بلاذر^(۲۰) پنی لیا تھا، جس کے باعث ان کی داڑھی کے بال گر گئے اور ان کی داڑھی بہت چھوٹی رہ گئی، جسے آپ اپنی دفات تک کالے خضاب سے رنگ لیا کرتے تھے۔ یہ بھی کہا کہ آپ اپنی کتابوں میں بہ کثرت غلطیاں کرتے ہیں، اس لیے کہ آپ جب کتاب سے فارغ ہو جاتے تو اس پر نظر ثانی کرنے کی آپ کو عادت نہیں تھی۔ میں (حافظ ذہبی) کہتا ہوں کہ ان کے کئی اوبام اور کئی رنگ ہیں، جس کی وجہ، علما اور کتابوں کی طرف عدم مراجعت ہے اور اسی طرح صرف کتابوں سے حصول علم بھی اس کا سبب ہے کہ انسان خطا کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کو مزید عمر ملتی اور ان کتابوں پر نظر ثانی کر لیتے تو ان میں سے بہت سی چیزوں کو وہ دوبارہ نہ لکھتے۔

بدرالدین زرکشی

محمد بن بہادر بن عبداللہ زرکشی، ابو عبداللہ، بدرالدین ان بڑے پختہ کار اور تجربہ کار علما میں سے ہیں جو آٹھویں صدی میں مصر میں اکٹھے ہوئے تھے۔ ارباب اجتہاد میں سے تھے، اصول دین، فقہ، تفسیر اور حدیث کے ماہر عالم تھے۔ ۷۴۵ھ-۱۳۴۴ کو قاہرہ میں، جہاں مدارس و مکاتب کے کثرت تھی، پیدا ہوئے۔ ترکی الاصل تھے۔ بچپن ہی میں حصول علم میں لگ گئے اور بہت جلد ہی شافعی مسلک پر عبور حاصل کیا۔ امام نووی کی کتاب المنہاج کو آزر کیا اور اسی نسبت سے منہاجی کہلائے۔ دیار مصر میں رئیس الشافعیہ جمال الدین اسنوی تھے جو مدرسہ کاملیہ میں نے بدل امام حدیث تھے۔ زرکشی نے ان کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیے اور بہت جلد ان کے

۱۹- ذہبی، مصدر سابق، ج ۲۱، ص ۳۷۸

۲۰- بلاذر فارسی زبان کا لفظ ہے۔ عربی میں حَبُّ الفہم اور حَبُّ القلب، جب کہ انگریزی میں Marking Nuts کہلاتا ہے۔ یہ ایک پہاڑی درخت کا پھل ہے جو بیر سے چھوٹا ہوتا ہے، اس کے سر پر ایک ٹوپی سی لگی ہوتی ہے جس کو کلاہ بلاذر کہتے ہیں۔ بلاذر کو دبانے سے شہد کی مانند سیاہ رنگ کی گاڑھی رطوبت نکلتی ہے جس کو غسل بلاذر کہتے ہیں۔ یہ پھل کسی قدر گول اور چپٹا ہوتا ہے اس لیے اس کو عربی میں حَبُّ القلب کہتے ہیں۔ یہ محلل اور مقوی اعصاب ہے اور نامردی کے علاج کے لیے کئی دوائیوں میں استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اس کا استعمال نقصان سے خالی نہیں۔ بعض مزاجوں میں اس سے گرمی زیادہ ہو جاتی ہے۔ (حکیم مظفر حسین اعوان، کتاب المفردات خواص الادویہ، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۹۶ء، ص ۱۲۸-۱۲۹)

صفِ اول کے تلامذہ میں اُن کا شمار ہونے لگا۔ حلب میں شیخ شہاب الدین ازرقی سے فقہ اور اصول کا علم حاصل کیا پھر دمشق جا کر ابن کثیر سے علم حدیث پڑھا، جس کے بعد آپ قاہرہ واپس لوٹ آئے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: ”وكان منقطعاً في منزله لا يتردد إلى أحد إلا إلى سوق الكتب وإذا حضره لا يشتري شيئاً وإنما يطالع في حانوت الكتبي طول نهاره ومعه ظهور أوراق يعلق فيها ما يعجبه ثم يرجع فينقله إلى تصانيفه.“^(۲۱) (لوگوں سے الگ اپنے گھر میں رہا کرتے تھے، کسی سے ملتے ملائے نہ تھے۔ باہر نکلتے تو کتابوں کی دوکانوں کا رخ کرتے، وہاں بھی کچھ خرید و فروخت نہ کرتے بلکہ کتب کی دوکان پر بیٹھ کر سارا سارا دن مطالعہ کرتے، اور جو لطیفہ اور نکتہ اُن کے سامنے آتا، اُسے اوراق میں لکھ لیتے اور جب گھر لوٹ آتے تو اُن کو اپنی تصانیف میں شامل کر لیتے۔)

آپ اپنی کتابیں خود لکھتے، کسی وراق سے نہ لکھواتے۔ چون کہ نہایت بدخط تھے اس لیے بعد میں اُن کی کتابوں کو نقل کرنے والوں کو سخت دقت اور مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ رجب ۷۹۲ھ-۱۳۹۲ء کو مصر میں وفات پائی۔^(۲۲) انھوں نے اس موضوع پر اگرچہ کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی، لیکن اپنی کتاب البرہان کی جلد اول، نوع: ۷۱ میں معرفة ما فيه من غير لغة العرب کے عنوان کے تحت سیر حاصل بحث کی ہے اور قرآنی معرب کی مثالیں پیش کی ہیں۔

تاج الدین سبکی

عبدالوہاب بن علی بن عبدالکافی، ابو نصر، ۷۲۷ھ-۱۳۲۷ء کو قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کے ساتھ دمشق منتقل ہوئے۔ اَلسُّبُک کی طرف منسوب ہو کر سبکی کہلائے جو مَمْفُوس کے علاقے مَنُوف کے ضلع اَلْمَنُوفِيَّة میں ایک جگہ کا نام ہے۔ شافعی علما کے خاندان اَلسُّبُکِي سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاج الدین دمشق اور قاہرہ میں استاذ، مفتی، قاضی، حاکم اور جامع اموی کے خطیب رہے ہیں۔ ۷۶۹ھ کو ۸۰ دن کے لیے جیل کی ہوا کھانی پڑی

۲۱- ابن حجر عسقلانی، الدرر الكامنة في أعيان المائة الثامنة، بيروت، دار الجليل، ۱۴۱۳ھ-۱۹۹۳ء، ج ۳، ص ۳۹۸

۲۲- عسقلانی، نفس مصدر، ج ۳، ص ۳۹۷، شذرات الذهب في أخبار من ذهب، ج ۶، ص ۳۳۵؛ ذہبی،

اور پھر اپنے منصب پر بحال ہوئے۔ ۱۷۷۰ء-۱۳۷۰ء کو بہ عارضہ طاعون وفات پائی۔^(۲۳) ہمارے اس موضوع سے متعلق اُن کی کتاب کا نام مُعَيْدُ النَّعْمِ وَ مُبِيدُ النَّقْمِ ہے، جو ۱۲ صفحات پر مشتمل ایک چھوٹی سی کتاب ہے، جس میں اُن کا موضوع قرآنی معرب نہیں، بلکہ بنیادی پر یہ کتاب سیاسی، سماجی اور عسکری معرب مصطلحات کی ہے۔ اُن کی یہ کتاب ڈاکٹر صلاح الدین ہواری کی تحقیق کے ساتھ المکتبة العصرية بیروت سے شائع ہو گئی ہے۔

جلال الدین سیوطی

عبد الرحمن ابن ابی بکر بن محمد جلال الدین سیوطی (۱۱۳۵ء-۹۱۱ء/۱۱۳۵ء-۱۵۰۵ء، نام ور مصنف ہیں جن کی تقریباً چھ سو کے قریب تصانیف ہیں۔ قاہرہ میں پیدا ہوئے آپ کی تصانیف بہت سے علوم و فنون کا احاطہ کرتی ہیں۔^(۲۴)

ہمارے اس موضوع سے متعلق انھوں نے الإِتْقَانُ فِي عِلْمِ الْقُرْآنِ میں نوع: ۳۸ میں فیما وقع فیہ من غیر لغة العرب اور نوع: ۶۹ میں فیما وقع فی القرآن من الأسماء والکُنْیِ والألقاب کے عنوان کے تحت سیر حاصل بحث کی ہے اور قرآنی معرب کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ ان جزوی مباحث کے علاوہ اس موضوع سے متعلق اُن کی ایک نہایت نفیس کتاب بھی ہے، جو عام اور متداول ہے جس کا نام الْمُهْدَبُ لِمَا فِي الْقُرْآنِ مِنَ الْمُعْرَبِ ہے، جس میں ۱۲۵ مُعْرَبِ الْفَظِّ سے بحث کی گئی ہے۔

خفاجی

احمد بن محمد بن عمر، شہاب الدین خفاجی مصری، خفاجہ قبیلہ کی نسبت سے خفاجی کہلائے۔ قاہرہ کے نواح میں ۹۷۷ھ-۱۵۶۹ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے ماموں ابو بکر شَنْوَانِي سے حاصل کی اور اُن سے فقہ حنفی اور فقہ شافعی پڑھی۔ آپ روم ایللی کے عہدہ قضا پر بھی فائز رہے ہیں، جس کے بعد ترقی کر کے سلطان مراد کے زمانے میں اُسکوب کے قاضی ہو گئے۔ معزول ہو جانے کے بعد شام اور حلب کے سفر کیے۔ مصر واپس آ کر پھر قاضی

۲۳- عسقلانی، مصدر سابق، ج ۲، ص ۳۲۵؛ ذہبی، مصدر سابق، ج ۴، ص ۱۸۵

۲۴- زرکلی، الأعلام، ج ۳، ص ۳۰۱

بنادیے گئے اور مصر ہی میں ۱۰۶۹ھ - ۱۶۵۹ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔^(۲۵) ہمارے اس موضوع سے متعلق اُن کی نہایت باوقار اور تحقیقی کتاب کا نام شفاء الغلیل فیما فی کلام العرب من الدخیل ہے، جو جو الیقینی کی کتاب کے بعد کا درجہ رکھتی ہے اور ڈاکٹر محمد کشاش کی تحقیق کے ساتھ دارالکتب العلمیۃ بیروت سے ۴۱۶ صفحات میں شائع ہو گئی ہے۔

حمزہ فتح اللہ مصری

اسکندریہ میں ۱۲۶۶ھ - ۱۸۴۹ء کو پیدا ہوئے، قاہرہ منتقل ہوئے۔ ازہر میں تعلیم حاصل کی، وہاں سے تیونس چلے گئے اور وہاں الرائد التونسی کے نام سے ایک جریدہ جاری کیا۔ آٹھ سال وہاں اقامت پذیر رہے، وہاں سے اسکندریہ تشریف لے گئے اور تقریباً تیس سال تک وزارت معارف سے منسلک رہے۔ ۱۳۳۶ھ - ۱۹۱۸ء کو وفات پائی۔^(۲۶) اس فن سے متعلق اُن کی کتاب کا نام الأصل والبیان فی معرب القرآن ہے۔ مصنف علام نے حافظ سیوطی کی کتاب کو محض مکرر کیا ہے، اور اس میں کوئی مزید اضافہ نہیں کر سکے۔^(۲۷)

ڈاکٹر محمد السید علی بلاسی

الأصل و البیان ۳۸۰ صفحات پر مشتمل نہایت عمدہ کتاب ہے، جس میں ۱۶۱ قرآنی معرب الفاظ سے بحث کی گئی ہے۔ اسے ۱۳۶۹ھ - ۲۰۰۱ء کو جمعیت الدعوة الإسلامية لیبیا نے شائع کیا ہے۔

قرآن کریم میں غیر عربی الفاظ کے حوالے سے عربی زبان کا دامن اگرچہ پُر ثروت ہے، لیکن اردو زبان میں اس طرح کی قابل ذکر نگارشات موجود نہیں ہیں، اس لیے مناسب محسوس ہوا کہ اس موضوع پر اہل علم کی تحقیقات کی روشنی میں قرآن کریم میں واقع ہونے والے معرب الفاظ کے بارے میں خامہ فرسائی کی جائے۔ اس لیے اب ہم یہاں قرآن کریم میں واقع ہونے والے معرب الفاظ کو ترتیب کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔

۲۵ - محمد امین بن فضل اللہ حموی، خلاصة الأثر فی أعيان القرن الحادي عشر، مصر، ۱۲۸۴ھ، ج ۱، ص ۳۳۱؛ ذہبی، مصدر

سابق، ج ۱، ص ۲۳۸

۲۶ - ذہبی، مصدر سابق، ج ۲، ص ۲۸۰

۲۷ - ڈاکٹر محمد السید علی بلاسی، المعرب فی القرآن الکریم، لیبیا، جمعیت الدعوة الإسلامية، ۱۳۶۹ھ - ۲۰۰۱ء، ص ۱۲

الآخرة

قرآن مجید میں ہے: ﴿مَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ﴾^(۲۸) (ہم نے تو یہ بات کبھی مذہب میں نہیں سنی۔) امام بدرالدین زرکشی لکھتے ہیں: ”(الملة الآخرة) أي الأولى بالقبطية والقبط يسمون الآخرة الأولى والأولى الآخرة الملة.“^(۲۹) (قبطیہ میں الملة الآخرة کے معنی الملة الأولى (پچھلا مذہب) کے ہیں۔)

آدم علیہ السلام

امام ابو منصور جو الیقینی اور ابن جوزی نے تصریح کی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے تمام اسماء عجمی ہیں، البتہ چار نام: آدم، صالح، شعیب اور محمد علیہم الصلوٰت والسلام اس سے مستثنیٰ ہیں۔^(۳۰)

امام زرخشی لکھتے ہیں: ”واشتقاقهم «آدم» من الأدمة، ومن أديم الأرض، نحو اشتقاقهم «يعقوب» من العقب، و «إدریس» من الدرّس، و «إبلیس» من الإبلّاس. وما آدم إلا اسم أعجمي: وأقرب أمره أن يكون على فاعل، كآزر، وعازر، وعابر وشالغ. وفالغ، وأشباه ذلك.^(۳۱) (لوگوں کا آدم کو ادمۃ یا ادم الارض سے مشتق بتانا ایسا ہے جیسا کہ یعقوب کو عقب سے، إدریس کو دَرَس سے اور إبلیس کو إبلّاس سے مشتق بتانا، حالاں کہ آدم قطعی عجمی نام ہے جس کا فاعل کے وزن پر ہونا زیادہ قرین قیاس ہے، جیسے کہ آزر، عازر، عابر، شالغ اور فالغ^(۳۲) وغیرہ۔) امام بیضاوی ۲۸- ص: ۷

۲۹- زرکشی، البرهان، ج ۱، ص ۲۸۸؛ سیوطی، الإنقان، ج ۱، ص ۱۸۰، ڈاکٹر محمد التوحی، المعرب والدخیل فی اللغة العربیة و آدابها، بیروت، دار المعرفۃ، ۱۴۲۶ھ - ۲۰۰۵ء، ص ۱۹۱

۳۰- جو الیقینی، المعرب، ص ۱۰۲؛ ابن جوزی، فنون الأفنان، ص ۱۱۵

۳۱- جار اللہ محمود بن عمر زرخشی، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل وعیون الأقاویل فی وجوه التأویل،

کراچی، کتب خانہ مظہری، بدون تاریخ، ج ۱، ص ۱۲۵

وزن پر ہونا زیادہ قرین قیاس ہے، جیسے کہ آزر، عازر، عابر، شالخ اور فالخ^(۳۲) وغیرہ۔) امام بیضاوی لکھتے ہیں:

”وَأَدَمَ اسْمٌ أَعْجَمِي كَأَزَرَ وَشَالِحٍ، وَاشْتِقَاقُهُ مِنَ الْأُدْمَةِ أَوْ الْأُدْمَةِ بِالْفَتْحِ بِمَعْنَى الْأُسُوءَةِ، أَوْ مِنَ الْأُدِيمِ الْأَرْضِ... أَوْ مِنَ الْأَدَمِ أَوْ الْأُدْمَةِ بِمَعْنَى الْأَلْفَةِ، تَعْسُفٌ كَاشْتِقَاقِ إِدْرِيسَ مِنَ الدَّرْسِ، وَيَعْقُوبَ مِنَ الْعَقَبِ، وَإِبْلِيسَ مِنَ الْإِبْلَاسِ.“^(۳۳) (آدم عجمی نام ہے، جیسے آزر اور شالخ، اسے اُدْمَةٌ بمعنی اُسوہ و نمونہ یا اُدیم الارض [روئے زمین سے لینے کی نسبت سے] یا ادم / اُدْمَةُ بمعنی اُلْفَت و محبت سے ماخوذ ماننا اس طرح ہے جیسا کہ ادریس کو درس سے، یعقوب کو عقب سے اور ابلیس کو ابلاس سے ماننا تَعْسُفٌ ہے۔“^(۳۴)

۳۲- خیال رہے کہ ادریس اور ابلیس کے غیر منصرف ہونے کی جو دلیل زمخشری نے پیش کی ہے، وہ یہاں معتبر نہیں، کیوں کہ ادریس و ابلیس کو اگر عجمی نہ مانا جائے تو ان کے غیر منصرف ہونے کے لیے صرف ایک سبب یعنی عَلَيَّتِ باقی رہ جاتا ہے جو غیر منصرف ہونے کے لیے کافی نہیں، اس لیے ان کا غیر منصرف ہونا ان کے عجمی ہونے کی دلیل ہے، لیکن آدم میں ایسا نہیں، کیوں کہ اگر اس کو عجمی نہ مانا جائے تو اس کے غیر منصرف ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لیے کہ اس کے غیر منصرف ہونے کے لیے اس میں عَلَيَّتِ کے علاوہ وزنِ فعل موجود ہے، اس صورت میں آدم دراصل اُدْمٌ تھا جس میں دو ہمزہ ہیں، پھر چون کہ ہمزہ ثانیہ ساکن ہے، جس کا ماقبل مفتوح ہے، اس لیے اسے الف سے تبدیل کر دیا گیا، ہاں آدم کی جمع اُوَادِمٌ اور تصغیر اُوَيْدِمٌ کے ساتھ آنا زمخشری کے خیال کی تائید کرتا ہے، کیوں کہ اگر آدم، اُدْمٌ ہوتا تو اس کی جمع (اُدْمٌ) اور تصغیر (اُوَيْدِمٌ) بھی ہمزہ کے ساتھ ہوتی۔ (دیکھیے: محمد عبدالرشید نعمانی، لغات القرآن مع

فہرست الفاظ، لاہور، مکتبہ حسن سہیل، ج ۱، ص ۵۷

۳۳- ناصر الدین ابوالخیر عبداللہ بن عمر محمد شیرازی، أنوار التنزيل و أسرار التاويل المعروف به تفسير البيضاوي،

بيروت، دار إحياء التراث العربي، ۱۴۱۸ھ - ۱۹۹۸ء، ج ۱، ص ۶۹

۳۴- تَعْسَفَ فِي الْقَوْلِ: بے راہ روی کرنا، ایسے معنی پر حمل کرنا جس پر دلالت ظاہر نہ ہو۔

آزر

یہ اسم عجمی ہے۔^(۳۵) ”فاعل“ کے وزن پر عابر، فالغ اور شالخ کی طرح عبرانی لفظ ہے اور عجمیت و علمیت کے سبب غیر منصرف ہے، بہ قول زمخشری: ”والأقرب أن يكون وزن آزر فاعل مثل: تارح وعابر وعازر وشالغ وفالغ وما أشبهها من أسماءهم.“^(۳۶) (زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ آزر ”فاعل“ کے وزن پر ہو، جیسے عابر، عازر، شالخ، فالغ اور اس طرح کے دیگر اسماء۔) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: ”سفر تکوین ۱۱/۲۶ میں اس کا نام تیرح ہے، جس میں سے ح کو حذف کر کے تڑا پڑھا گیا اور غمبجر [Geiger] کے حوالے سے لکھا ہے کہ تڑا میں قلب مکانی ہو کر پہلے آثر اور پھر آزر بنا۔“^(۳۷)

چوں کہ تورات اور تاریخ میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ اور قرآن عزیز میں آزر آیا ہے، اس لیے علماء اور مفسرین نے اس مسئلے کی تحقیق میں دورائیں قائم کیں۔

۱- ایسی صورت اختیار کی جائے کہ دونوں ناموں کے درمیان مطابقت ہو جائے اور یہ اختلاف جاتا رہے۔

۲- تحقیق کے بعد فیصلہ کن بات کی جائے کہ ان دونوں میں کون سی بات صحیح اور کون سی غلط ہے، یا دونوں باتیں صحیح ہیں مگر یہ دو جدا جدا ہستیوں کے نام ہیں۔

پہلے خیال کے علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ دونوں نام ایک ہی شخصیت سے وابستہ ہیں اور تارخ، علم اسمی (اسمی نام) ہے، جب کہ آزر، علم وصفی [وصفی نام] ہے: ”وقیل: العلم تارخ و آزر وصف، معناه: الشيخ أو المعوج.“^(۳۸) ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ آزر عبرانی زبان میں محب صنم کو کہتے ہیں اور تارخ میں چوں کہ بت تراشی اور بت پرستی دونوں وصف موجود تھے، اس لیے آزر کے لقب سے مشہور ہوا اور بعض علماء کا

۳۵- جوالیقی، المعرب، ص ۱۰۸

۳۶- زمخشری، الکشاف، ج ۲، ص ۳۹

۳۷- جوالیقی، مصدر سابق، ص ۱۳۵

۳۸- بیضاوی، تفسیر البیضاوی، ج ۱، ص ۳۱۷

خیال ہے کہ آزر کے معنی أعرج یعنی کم فہم، بے وقوف اور پیر فرتوت کے ہیں: ”کلمة ذم في بعض اللغات أي: يا أعرج، قال السهيلي: وفي التكملة: يا أعرج، أو كأنه قال وإذ قال إبراهيم لأبيه الخاطيء، وفي التكملة: يا مخطيء، يا خرف، وقيل معناه: يا شيخ، أو هي كلمة زجرٍ ونهي عن الباطل.“^(۳۹) چوں کہ تاریخ میں یہ سب باتیں موجود تھیں اس لیے اس وصف سے یاد کیا گیا۔ قرآن عزیز نے اس کے مشہور و صنفی علم کو بیان کیا۔ دوسرے خیال کے علما کی تحقیق یہ ہے کہ آزر اس بت کا نام ہے جس کا تاریخ پجاری تھا جیسا کہ مجاہد کا خیال ہے: ”إن آزر اسم صنم، وكان اسم أبيه تاريخ.“^(۴۰) ابن جریر لکھتے ہیں: ”فأما الذي ذكر أن آزر اسم صنم، وإنما نصبه بمعنى: أتخذ آزر أصنامًا آلهة، فقولٌ من الصواب من جهة العربية بعيدٌ، وذلك أن العرب لا تنصب اسما بفعلٍ بعد حرف الاستفهام، لا تقول: أخاك أكلمت، وهي تريد: أكلمت أخاك.“^(۴۱) (عربیت کے لحاظ سے یہ قطعاً درست نہیں، بلکہ صحت سے بہت بعید ہے، اس لیے کہ عرب، حرف استفہام کے بعد کسی اسم کو فعل سے منصوب نہیں کرتے، وہ ”أخاك أكلمت“ نہیں کہیں گے بلکہ ”أكلمت أخاك“ کہیں گے۔) مزید ارشاد فرماتے ہیں: ”فأولى القولين بالصواب منهما عندي قولٌ من قال: هو اسم أبيه، لأن الله تعالى ذكره أخبر أنه أبوه، وهو القول المحفوظ من قولي أهل العلم دون القول الآخر الذي زعم قائله أنه نعت.“^(۴۲) (میرے نزدیک ان لوگوں کی بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ آزر ان کے باپ کا نام تھا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ آزر کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے باپ کہتے ہیں۔ اہل علم کا یہی قول محفوظ ہے، اور وہ قول غیر محفوظ ہے جس

۳۹- زبیدی، تاج العروس، مادہ: آزر

۴۰- ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب ماوردی بصری، النکت والعیون السمی بتفسیر الماوردی، تحقیق: سید بن عبدالمقصود

ابن عبد الرحیم، بیروت، دارالکتب العلمیة، بدون تاریخ، ج ۲، ص ۱۳۳؛ ابن منظور افریقی، لسان العرب، حرف

الراء، فصل الألف

۴۱- ابو جعفر محمد بن جریر طبری، تفسیر الطبری، بیروت، دارالکتب العلمیة، ۱۴۱۲ھ-۱۹۹۲ء، ج ۵، ص ۲۳۰

۴۲- طبری، مصدر سابق، ج ۵، ص ۲۳۰

میں کہا گیا ہے کہ یہ وصفی نام تھا۔) مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی^(۳۳) لکھتے ہیں کہ: ہمارے نزدیک یہ تمام تکلفات بارہ ہیں، اس لیے کہ ”قرآنِ عزیز نے جب صراحت کے ساتھ آزر کو اب ابراہیم (علیہ السلام) کہا ہے تو پھر محض علمائے انساب اور بائبل کے تخمینہ قیاسات سے متاثر ہو کر قرآنِ عزیز کے یقینی تعبیر کو مجاز کہنے یا اس سے آگے بڑھ کر خواہ مخواہ قرآنِ عزیز میں نحوی مقدرات ماننے پر کون سی شرعی اور حقیقی ضرورت مجبور کرتی ہے؟“^(۳۴) مولانا عبد الماجد دریابادی^(۳۵) فرماتے ہیں کہ:

”آزر“ عربی، توریت میں اس نام کا املا ”تارح“ ملتا ہے اور انگریزی میں تیرا [Terah] اور تالمود میں ”ترائی“۔ جو لوگ علم اللسان کے مبادی سے بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایک ہی نام مختلف زبانوں میں جا جا کر کیسے کیسے عجیب تلفظ اختیار کر لیتا ہے، فلسطین کے قدیم مسیحی مؤرخ یوسیبیس [Eusebius]^(۳۶) کے ہاں آشر یا ہاتھر آیا ہے، ان دونوں تلفظوں کی مشابہت و مماثلت آزر سے بالکل ظاہر ہے اور آزر و زارہ بھی اگر ایک ہی مادہ سے مشتق ہوں تو کچھ بعید نہیں۔^(۳۷)

۳۳- حفظ الرحمن بن مولوی شمس الدین صدیقی ۱۹۰۱ء کو سیوہارہ، ضلع بجنور (ہند) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سیوہارہ کے مدرسہ، فیض عام، میں حاصل کی اس کے بعد مشہور علمی درس گاہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، جہاں آپ کو علامہ انور شاہ محدث کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی، مفتی عزیز الرحمن اور میاں اصغر حسین جیسے نادرہ روزگار اساتذہ سے استفادے کا موقع ملا۔ بڑے پائے کے عالم تھے۔ ۲- اگست ۱۹۶۲ء کو کینسر کے مرض سے وفات پائی۔ نماز جنازہ قاری محمد طیب نے پڑھائی۔ (شاہکار اسلامی انسائیکلو پیڈیا، ج ۲، ص ۸۷۵)

۳۴- محمد حفظ الرحمن سیوہاری، قصص القرآن، لاہور، مکتبہ مدنیہ، بدون تاریخ، ج ۱، ص ۱۵۳

۳۵- عبد الماجد، ۱۸۹۲ء کو قصبہ دریاباد (ہند) میں عبدالقادر کے گھر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ کینگ کالج لکھنؤ سے گریجویشن کیا۔ ۱۹۱۳ء میں فلسفہ پڑھنے کی خاطر علی گڑھ کالج کا رخ کیا، لیکن ایم اے کے امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ۱۹۲۸ء میں مولانا اشرف علی صاحب تھانوی سے استفادہ شروع کیا۔ ۱۹۶۷ء میں فوت ہوئے۔ (مسلم شخصیات کا انسائیکلو پیڈیا، ص ۴۱۵)

۳۶- یوسیبیس قریباً ۲۶۰ء میں پیدا ہوئے اور قریباً ۳۴۰ء میں فوت ہوئے۔ ۱۳۵م میں قیصر یہ کابشپ بنے۔ ۳۲۵ء میں کونسل آف نیقیہ، ۳۳۵ء میں کونسل آف طاز میں شرکت کی۔ (Ecclesiastica History) تاریخ کلیسیا دس جلدوں میں ان کی مشہور کتاب ہے جو چوتھی صدی عیسوی کے رجب اول تک عیسائیت کی ایک مسلمہ تاریخ ہے۔ (دی آکسفورڈ ڈکشنری آف کریسچین چرچ، ص ۴۸۱)

۳۷- عبد الماجد دریابادی، تفسیر ماجدی، لاہور، تاج کمپنی لمیٹڈ، بدون تاریخ، ص ۲۹۷، حاشیہ ۱۱۳

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ اور چچا کا نام آزر تھا، آزر ہی نے ان کی تربیت کی تھی اور انھیں اپنی اولاد کی طرح پالا تھا، اس لیے قرآن عزیز نے آزر کو اب ابراہیم کہہ کر پکارا جیسا کہ روایت میں ہے: ”الْعَمُّ صِنُوْاْبِيْه“، (چچا باپ ہی کی طرح ہے) اور قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ: ﴿نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ ءَاْبَايَكَ اِنْزِهْتُمْ وَاِسْمَعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَاَحَدًا﴾^(۴۸) یہ بات ظاہر ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام سیدنا یعقوب علیہ السلام کے دادا، سیدنا اسماعیل علیہ السلام ان کے تایا اور سیدنا اسحاق علیہ السلام ان کے والد ہیں مگر ان سب پر مجازی طور پر ”آب“ کا اطلاق کیا گیا ہے۔ اسی طرح: ﴿وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ ءَاَزْرَ﴾^(۴۹) میں بھی آزر کو مجازاً ابراہیم علیہ السلام کا باپ کہا گیا ہے۔

سید رشید رضا^(۵۰) نے اس اعتراض کا جواب یوں دیا ہے: وَأَضْعَفُ مَا قَالُوْهُ فِي الْجَمْعِ بَيْنَ الْقَوْلِيْنَ اَنْ اَزْرَ اسْمُ عَمِّهٖ بِنَاءِ عَلٰى اَنْ الْعَرَبُ تَسْمِي الْعَمَّ اَبًا مَّجَازًا، وَهَذِهِ الدَّعْوٰى لَا تَصِحُّ عَلٰى اِطْلَاقِهَا، وَاِنَّمَا يَصِحُّ ذٰلِكَ حَيْثُ تَوْجَدُ قَرِيْنَةٌ يَعْلَمُ مِنْهَا الْمُرَادَ، وَلَا قَرِيْنَةَ هُنَا وَلَا فِي سَائِرِ الْاٰيَاتِ الَّتِي ذَكَرَ فِيْهَا مِنْ غَيْرِ تَسْمِيَةٍ.^(۵۱) (یہ بات درست ہے کہ عربی زبان میں چچا اور دادا کو بھی مجازاً باپ کہا جاتا ہے، لیکن یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ ہر مقام پر اب سے مراد چچا یا دادا ہی لیا جائے، جہاں اس کا استعمال مجازی معنوں میں ہوتا ہے وہاں اس کے لیے کوئی دلیل اور قرینہ صارفہ موجود ہوتا ہے، جب کہ یہاں کوئی

۴۸- البقرة: ۱۳۳

۴۹- الأنعام: ۷۴

۵۰- محمد رشید رضا بن علی رضا بن محمد شمس الدین بن محمد بہاء الدین بن منلا علی خلیفہ قلمونی، بغدادی الاصل اور حسین بنی النسب ہیں۔ طرابلس (شام) میں ۱۲۸۲ھ - ۱۸۶۵ء کو قلمون میں پیدا ہوئے۔ وہاں پلے بڑھے اور وہیں اور طرابلس میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۳۱۵ھ میں مصر جا کر شیخ محمد عبدہ کے سامنے زانوئے تلمذتہ کر لیے۔ ہند، حجاز مقدس اور یورپ کے سفر کیے۔ مصر میں رہائش اختیار کی۔ ۱۳۵۴ھ - ۱۹۳۵ء کو سویس سے قاہرہ واپس لوٹے ہوئے اچانک موٹر میں وفات پائی۔ (ذہبی، سیر أعلام النبلاء، ج ۶، ص ۱۲۶)

۵۱- رشید رضا، تفسیر المنار، مصر، الهيئة العامة المصرية للكتاب، ج ۷، ص ۵۳۶

ٹھوس دلیل، شرعی ضرورت اور قرینہ صارفہ موجود ہی نہیں، اس لیے آزر، سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہی کے والد کانام تھا۔)

نیز قرآن کریم میں ۱۳ مقامات پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے والد کا تذکرہ کیا گیا ہے اور کسی بھی مقام پر اَبُّ کے برخلاف عَمُّ کا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے:

۱- ﴿يَتَأْتِ﴾ (۵۲) ۲- ﴿لِأَبِيهِ﴾ (۵۳) ۳- ﴿أَبِي﴾ (۵۴) کیا یہ عجیب بات نہیں کہ قرآن ان ۱۳ مقامات میں صرف اَبُّ کا لفظ استعمال کرتا ہے اور عَمُّ کا لفظ قصداً چھوڑ دیتا ہے۔ اگر کسی ایک آیت کی بات ہوتی تو اس میں یہ تاویل مناسب سمجھی جاتی، لیکن ان سب آیات میں بغیر کسی شرعی برہان اور قرینہ صارفہ کے مجازی معنی لینا نہایت مضحکہ خیز ہے۔ نیز صحیح بخاری میں (۵۵) اُن کے والد کانام آزر ہی اختیار کیا گیا ہے، اب اسی صورت میں بغیر کسی قرینے اور ثبوت کے آزر کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا چچا بتا دینا قرین انصاف نہیں، کیوں کہ اس دعوے کے ثبوت میں نہ تو کوئی آیت موجود ہے اور نہ کوئی صحیح حدیث یا کوئی صحیح و مستند تاریخی روایت۔

آن / آنیۃ

حافظ جلال الدین سیوطی اور ڈاکٹر تونجی لکھتے ہیں: ”الذی انتھی حرّہ بلعۃ البربر.“ (۵۶) (بربری زبان میں نہایت گرم آگ کو کہا جاتا ہے۔) ﴿يَطُوفُونَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيمٍ آٰنٍ﴾ (۵۷) (وہ (جہنمی) اس کے

۵۲- مریم: ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵

۵۳- الأنعام: ۷۴؛ التوبة: ۱۱۴؛ مریم: ۴۴؛ الأنبياء: ۵۲؛ الشعراء: ۷۰؛ الصافات: ۸۵؛ الزخرف: ۲۶؛ الممتحنة:

۵۴- الشعراء: ۲۶

۵۵- صحیح البخاری، کتاب أحادیث الأنبياء، باب قول الله تعالى: ﴿اتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا﴾، حدیث: ۳۳۵۰

۵۶- سیوطی، الإتقان فی علوم القرآن، ج ۱، ص ۱۸۰؛ سیوطی، المہذب فیما وقع فی القرآن من العرب، مطبوعہ فضالة، ص ۲۵، تونجی، العرب والدخیل، ص ۱۹۱

۵۷- الرحمن: ۴۴

اور نہایت گرم پانی کے درمیان چکر کاٹتے ہوں گے۔ ﴿تَشْقَىٰ مِنْ عَيْنٍ آٰنِيَتٍ﴾^(۵۸) (انہیں گرمی سے کھولتے ہوئے چشمے سے پلایا جائے گا۔)

أَبٌ

قرآن مجید میں وارد ہے: ﴿وَفَكِهَةٌ وَأَبٌ﴾^(۵۹) حافظ سیوطی نے علامہ شیزلہ کی البرہان کے حوالے سے لکھا ہے: ”الأب: الحشيش بلغة أهل المغرب.“^(۶۰) (اہل مغرب کی بول چال میں (جانوروں کے کھانے کے) گھاس (اور چارے) کو کہتے ہیں۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: ”الأب: المرعى وما تعتلفه الأنعام، والكلمة بربرية.“^(۶۱) (أَبٌ چراگاہ اور جانوروں کے چارے کو کہا جاتا ہے اور یہ بربری زبان کا لفظ ہے۔) ”المرعى، وقيل: الأب للبهائم كالفاكهة للناس.“ (جانوروں کے کھانے کے گھاس اور چارے کو أَبٌ کہتے ہیں۔)^(۶۲) یہ کس زبان سے معرب ہے، اس بارے میں امام بدرالدین زرکشی لکھتے ہیں: ”الأب: الحشيش، بلغة أهل المغرب.“^(۶۳) (الأب، اہل مغرب (بربری) زبان کا لفظ ہے جسے چارے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔) شیخ حمزہ فتح اللہ بھی اسے بربری زبان کا لفظ بتاتے ہیں۔^(۶۴) جب کہ ڈاکٹر عبدالنعیم محمد حسنین اسے فارسی کے ”بے آب“ سے معرب کہتے ہیں، جس کے معنی بلا رونق اور خشک کے ہیں۔^(۶۵) لیکن وہ کون سی

۵۸- الغاشية: ۵

۵۹- عبس: ۳۱

۶۰- سیوطی، الإنقان، ج ۱، ص ۱۸۰؛ المہذب فیما وقع فی القرآن من المعرب، ص ۳۲

۶۱- تونجی، مرجع سابق، ص ۱۹۲

۶۲- ابو عبد احمد بن محمد ہروی، تحقیق احمد فرید مزیدی، الغریبین فی القرآن و الحدیث، بیروت، المكتبة العصرية،

۱۴۱۹ھ - ۱۹۹۹ء، ص ۳۷

۶۳- زرکشی، البرہان، ج ۱، ص ۲۸۹

۶۴- حمزہ فتح اللہ، الأصل والبیان فی معرب القرآن، مصر، مطبعة مصر الحرة، ص ۵

۶۵- عبدالنعیم محمد حسنین، قاموس الفارسیة، (فارسی - عربی)، تحت لفظ: ب

گھاس اور کون سا چارہ ہے اور اس کی شکل و صورت کیا ہے؟ اس کی تعیین میں اہل لغت کے متعدد اقوال ہیں: مجاہد، حسن بصری، قتادة اور ابن زید کہتے ہیں: الأَب للبهائم كالفاكهة لبني آدم. (۶۲) (انسانی غذا میں فَوَاكِهَةٌ (میوے) کا جو درجہ ہے چرندوں کی خوراک میں وہی حیثیت اس کی ہے۔) کہتے ہیں کہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جب اس کی تعیین کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا: ”أَيُّ سِمَاءٍ تُظَلِّئَنِي وَأَيُّ أَرْضٍ تُقَلِّئَنِي إِنْ قَلْتُ فِي كِتَابِ اللَّهِ مَا لَا أَعْلَمُ.“ (۶۷) (کون سا آسمان مجھ پہ سایہ فگن ہو گا اور کون سی زمین مجھے اپنے اوپر رہنے دے گی جب کہ میں کتاب اللہ کی تفسیر میں ایسی بات کہہ دوں جس کا مجھے علم نہیں۔) حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں: ”اس کی سند میں انقطاع ہے۔“ (۶۸) سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی وارد ہے یہ روایت زبان زد ہے کہ انھوں نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا کہ: ”قد علمنا ما الفاكهة، فما الأَب؟ ثم أحسبه، شك الطبري، قال: إن هذا لهُو التكلف.“ (۶۹) (ہم فاکھہ تو جانتے ہیں مگر یہ اَب کیا ہے؟ پھر خود فرمانے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ اس کی تعیین کا ہم کو مکلف کیا ہے اور نہ حکم دیا ہے۔“ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں: ”هو إسناد صحيح، وقد رواه غير واحد عن أنس به، وهذا محمول على أنه أراد أن يعرف شكله وجنسه وعينه وإلا فهو

۶۲- عماد الدین ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، تحقیق: لجنة من العلماء، رياض، دار عالم الكتب، ۱۴۲۵ھ - ۲۰۰۴ء، ج ۱۴، ص ۲۵۲

ص ۲۵۲

۶۷- ابو بکر خطیب بغدادی، الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع، تحقیق: عجاج الخطیب، بیروت، مؤسسة الرسالة، ط ۳، ۱۴۱۶ھ - ۱۹۹۶ء، ص ۳۵۷؛ ابو بکر احمد بن الحسن بن علی بیہقی، شعب الإیمان، بیروت، دار الكتب العلمیہ، ۱۴۱۰ھ - ۱۹۹۰ء، ج ۲، ص ۴۲۴؛ ابو عبد اللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی، الجامع لأحكام القرآن المعروف به تفسیر

القرطبي، بیروت، دار الكتاب العربي، ۱۴۱۸ھ - ۱۹۹۷ء، ج ۱، ص ۶۹؛ ج ۱، ص ۶۹؛ ج ۲، ص ۱۹۳؛ ابن کثیر، تفسیر ابن

کثیر، ج ۱۲، ص ۲۵۳؛ الوسی، تفسیر روح المعانی فی تفسیر القرآن الکریم و السبع المثانی، بیروت، مؤسسة

الرسالة، ۱۴۳۱ھ - ۲۰۱۰ء، ج ۵۷، ص ۳۰-۲۹

۶۸- ابن کثیر، مرجع سابق، ج ۱۲، ص ۲۵۳

۶۹- طبری، تفسیر ابن جریر الطبری، ج ۱۲، ص ۱۲؛ ابو عبد اللہ الحاکم نیشابوری، المستدرک علی الصحیحین،

بیروت، دار الفکر، ۱۳۹۸ھ - ۱۹۷۸ء، ج ۲، ص ۵۱۴؛ بیہقی، شعب الإیمان، ج ۲، ص ۲۲۴

وکل من قرأ هذه الآية يعلم أنه من نبات الأرض. “(۷۰) (اس کی سند صحیح ہے اور اسے کئی لوگوں نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کیا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ اس کی شکل و صورت اور اس کی تعیین معلوم نہیں، ورنہ اتنا تو صرف آیت کے پڑھنے سے ہر ایک قاری کو صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ یہ زمین سے اُگنے والی کوئی چیز ہے۔) مولانا حمید الدین فراہی (۷۱) لکھتے ہیں: ”یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی کہ سیدنا ابو بکر اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما، جیسا کہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے، اس لفظ سے ناواقف تھے۔ اس روایت کا پہلا حصہ منقطع ہے اور دوسرا حصہ مضطرب اور مندرجہ ذیل وجوہ سے ہمارے نزدیک یہ روایت بالکل ضعیف ہے، اس لیے کہ:

- ۱- یہ سورت مکی ہے۔ مکی زندگی میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا اصلی مشغلہ قرآن مجید کا پڑھنا پڑھانا ہی تھا، اگر یہ لفظ اُن کو معلوم نہ تھا تو دن رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے سہنے کے باوجود انھوں نے اس کو آپ سے کیوں نہیں دریافت کیا؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو کیوں نہیں بتایا؟ کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن مجید سے اس قدر بے پروا تھے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی، تب انھیں معلوم ہوا کہ یہ لفظ بغیر تحقیق کے رہ گیا ہے اور اُس وقت اُن کو اس کے عدم علم کا اعتراف کرنا پڑا۔
- ۲- قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زبان نہایت واضح اور سہل ہے۔ عرب کے اشعار اور خطبات کی جو عام زبان تھی اسی زبان میں وہ نازل ہوا ہے۔ عکاظ میں جو کلام پیش ہوتے اُن کے حُسن و بَیاض کا فیصلہ قریش ہی کرتے تھے۔ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہم کا شمار عرب کے مشہور سرداروں اور خطیبوں میں ہوتا تھا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہم تو گویا قریش کی زبان اور اُن کے ترجمان تھے۔ کلام پر اُن کی تنقیدیں اہل علم سے مخفی نہیں ہیں، اُن سے اندازہ ہوتا ہے

۷۰- ابن کثیر، مرجع سابق، ج ۱۲، ص ۲۵۳

۷۱- بر عظیم کے ممتاز عالم دین، ضلع اعظم گڑھ (U-P)، بھارت کے ایک گاؤں پھر بہار میں ۱۲۸۰ھ کو پیدا ہوئے۔ آپ مولانا شبلی نعمانی کے ماموں زاد بھائی تھے اور مولانا شبلی اُن سے چھ سال بڑے تھے۔ علوم کو اپنے دور کے بڑے علما سے حاصل کیا۔ مولانا عبدالحی کھنوی کے شاگرد بھی رہے ہیں۔ نہایت فطین اور ذکی تھے۔ عربی زبان میں مہارت کے ساتھ ساتھ عبرانی زبان پر بھی عبور رکھتے تھے۔ مسلم علی گڑھ کالج کے پروفیسر رہے ہیں۔ ۱۳۲۹ھ کو وفات پائی۔ (شاہکار اسلامی انسائیکلو پیڈیا، ج ۲، ص ۱۲۴۶)

کہ زبان کے معاملے میں اُن کا رتبہ کس قدر بلند تھا۔ پھر حیرت یہ ہے کہ ماہرین ادب و لغت قرآن مجید کے ایک لفظ سے بالکل بے خبر رہ گئے۔

۳- قرآن مجید عرب کی نہایت معروف اور کھلی ہوئی زبان میں اُترا، تاکہ لوگوں کو اس کے ذریعے سے دین کی دعوت دی جائے اور لوگ اس کی تعلیمات آسانی سے سمجھ لیں، اس بات کو خود قرآن مجید نے مختلف موقعوں پر مختلف انداز سے بیان کیا ہے، مثلاً فرمایا:

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيَلْسَنَ قَوْمِهِ لِئِبْرِيكَ لَهُمْ ﴾^(۴۲) (ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر اُس کی قوم کی زبان کے ساتھ تاکہ انہیں خوب وضاحت کرے۔) ایک دوسری جگہ فرمایا: ﴿ إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴾^(۴۳) (ہم نے اس کو بنایا عربی قرآن تاکہ تم اس کو سمجھ سکو۔) پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن مجید ایسے لفظ استعمال کرے جن کے معنی بڑے بڑے صحابہ کو بھی معلوم نہ ہوں؟ یہ بات تو اس کے عربی مبین ہونے کے صریح خلاف ہوگی۔

۴- جن لوگوں نے یہ روایت گھڑی ہے، انہوں نے اس کو اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب کر دیا ہے اور یہ معلوم ہے کہ جو لوگ صحابہ رضی اللہ عنہم کو بدنام کرنے کے شائق تھے وہ بیش تر بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم ہی کو نشانہ بناتے تھے۔^(۴۴)

أَبَارِيْقُ

إِبْرِيْقُ کی جمع ہے، جس کے معنی لوٹے، صراحی، جگ اور آب خورے کے ہیں۔ فارسی کے ”آب ریز“ کا مُعْرَب ہے^(۴۵)، پانی کا راستہ، ٹھہر ٹھہر کر پانی گرانہ۔^(۴۶) قرآن مجید میں ہے کہ: ﴿ يَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ

۴۲- ابراہیم: ۴

۴۳- یوسف: ۲

۴۴- ملاحظہ کیجیے: حمید الدین فراہی، مجموعہ تفاسیر فراہی، ترجمہ: امین احسن اصلاحی، لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ط ۲، اکتوبر ۱۹۹۸ء، ص ۲۷۰

۴۵- مجد الدین فیروز آبادی نے اسے ”آب ری“ کا معرب مانا ہے، جو غلط ہے۔

۴۶- ابو الحسن علی بن اسماعیل سیدہ مرسی، المحکم والمحیط الأعظم، تحت: مقلوبۃ ب ر ق، ابن منظور، لسان العرب، تحت لفظ: ق، فصل الباء، فیروز آبادی، القاموس المحیط، تحت: باب القاف، فصل الباء، زبیدی، تاج العروس، باب القاف، فصل الباء مع القاف، ب ر ق۔

مُخَلَّدُونَ . بِأَكْوَابٍ وَأَبَارِيقَ وَكَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ ﴿٤٧﴾ (اُن کی خدمت میں غلمان، جو ہمیشہ غلمان ہی رہیں گے، پیالے جگ اور شرابِ خالص کے جام لیے ہوئے گردش کر رہے ہوں گے۔)

اور سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت میں ہے کہ: ﴿إِنَّ أَمَامَكُمْ حَوْصًا كَمَا بَيْنَ جَرَبَاءَ وَأَذْرَحَ، فِيهِ أَبَارِيقُ كَنُجُومِ السَّمَاءِ مَنْ وَرَدَهُ فَشَرِبَ مِنْهُ لَمْ يَظْمَأْ بَعْدَهَا أَبَدًا﴾^(۷۸) (حشر میں تمہارے سامنے حوض (کوثر) ہو گا جس کے دونوں کناروں میں اتنا فاصلہ ہے جتنا کہ جَرَبَاءَ اور أَذْرَحَ میں، اُس پر آسمان کے ستاروں کے مانند آب خورے ہیں، جو اس کے پاس آکر پانی پیے گا اس کے بعد وہ کبھی تشنہ نہیں ہو گا۔) جَرَبَاءَ اور أَذْرَحَ ملک شام میں دو گاؤں کے نام ہیں، جن کے درمیان تین منزل کا فاصلہ ہے، یہاں یہودی آباد تھے، جن کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امن نامہ لکھا تھا۔^(۷۹) لحياني^(۸۰) کہتے ہیں: ”إبريق: إذا كانت برّاقة.“^(۸۱) (یہ برق سے ہے اور ہر چمک دار اور خوب صورت چیز کے لیے بولا جاتا ہے۔)

إبراهيم عليه السلام

جوابتی لکھتے ہیں: ”أسماء الأنبياء كلها أعجمية نحو: إبراهيم وإسماعيل وإسحق و إيلياس وإدريس وإسرائيل وأيوب إلا أربعة أسماء وهي: آدم وصالح وشعيب ومحمد عليهم

۷۷- الواقعة: ۱۷- ۱۸

۷۸- صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب إثبات حوض نبينا أو صفاته، حديث: ۳۵- [۲۲۹۹]

۷۹- مجد الدين ابو السعادات المبارك بن محمد بن اثير جزري، النهاية في غريب الحديث، بيروت، دار الكتب العلمية،

۱۴۱۸ھ - ۱۹۹۷ء، ج ۱، ص ۲۳۶

۸۰- علي بن مبارك اور ایک روایت کے مطابق: ابن حازم - ابو الحسن لحياني - بنو لحيان بن بديل بن مدرکہ کی نسبت سے لحياني کہلائے۔ بعض کا خیال ہے کہ لمبی داڑھی رکھنے سے لحياني کہلائے۔ امام کسائی کے شاگرد رہے ہیں۔ تاریخ تولد اور تاریخ وفات دستیاب نہیں۔ (جلال الدين سيوطي، بغية الوعاة في طبقات اللغويين والنحاة، لبنان، المكتبة العصرية،

ج ۲، ص ۱۸۵

۸۱- ابو منصور محمد بن احمد ازہری، تهذيب اللغة، أبواب القاف و الراء

السلام۔“^(۸۲) (سارے انبیا کے نام عجمی ہیں، جیسے سیدنا ابراہیم، سیدنا اسماعیل، سیدنا اسحاق، سیدنا ادریس، سیدنا اسرائیل اور سیدنا ایوب علیہم السلام، البتہ چار انبیا کے نام عربی ہیں: سیدنا آدم، سیدنا صالح، سیدنا شعیب اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

اَبْلَعِي

قرآن مجید میں ہے: ﴿ وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكَ وَيَكْسِمَاءُ أَقْلَعِي وَغِيصَ الْمَاءِ وَقَضَى الْأَمْرُ وَأَسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ ﴿ ^(۸۳) (اور حکم ہوا کہ اے زمین! اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان! تھم جا اور پانی اُتار دیا گیا اور معاملے کا فیصلہ ہو گیا اور کشتی کوہِ جودی کو جا لگی۔)

اَبْلَعِي: ”تو نگل جا“ (باب فَتْح) بَلْعُ (بہ معنی نگلنا) سے امر کا صیغہ ہے۔ واحد مونث حاضر؛ وہب بن منبہ ^(۸۴) سے منقول ہے کہ یہ حبشی زبان کا لفظ ہے۔ ^(۸۵) ڈاکٹر تونسجی لکھتے ہیں کہ: ”اَبْلَعِي: ازدری، قیل: ہی حبشیہ، وقیل ہندیہ۔“ ^(۸۶) (اَبْلَعِي کے معنی ازدری کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حبشی زبان کا لفظ ہے اور یہ بھی ایک قول ہے کہ یہ ہندی زبان کا قول ہے۔)

سید آلوسی بغدادی لکھتے ہیں:

وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي أَي: أَي انشفي استعير من ازدراد الحيوان ما يأكله للدلالة على أن ذلك ليس كالشف المعتاد التدريجي، استعير من: ازدراد الحيوان ما ما يأكله للدلالة على أن ذلك ليس

۸۲- جوالیقی، المغرب، ص ۱۰۲

۸۳- ہود: ۴۴

۸۴- ابو عبد اللہ وہب بن منبہ ابنادوی صنعانی ذماری ابو عبد اللہ، ۳۴ھ - ۶۵۴ء کو صنعائیں پیدا ہوئے۔ مؤرخ اور اسرائیلیات کے بہت بڑے عالم ہیں۔ خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے انھیں صنعاء کا قاضی مقرر کیا تھا۔ ۱۱۴ھ - ۳۲ء کو صنعائیں وفات پائی۔ (ابن خلکان، وفيات الأعيان، ج ۶، ص ۳۵-۳۶؛ خیر الدین زرکلی، الأعلام، ط ۱۵، ج ۸، ص ۱۲۵)

۸۵- ابن ابی حاتم، تفسیر ابن ابی حاتم، سعودی عرب، مکتبۃ نزار مصطفیٰ الباز، ط ۱۹، ج ۳، ص ۲۰۳۶

۸۶- التونجی، المغرب والدخیل، ص ۱۹۲

کالشف المعتاد التدریجی... وأخرج ابن المنذر وغيره عن وهب بن منبه أن البلع بمعنى الازدراد لغة حبشية، وأخرج أبو الشيخ عن جعفر بن محمد عن أبيه أنه بمعنى الشرب لغة هندية. (۸۷)

وَقِيلَ يَتَأْرَضُ أَبْلَعِي فِي مَعْنَى انشغبي (خشک کرنے، نکل جانے) کے ہیں۔ یہ استعارہ ہے کیوں کہ یہ لفظ حیوان کے لیے مستعمل ہے۔ اس کو زمین کے چوس لینے میں استعارہ فرمایا، اس معنی میں کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ زمین کا یہ چوس لینا ویسا تدریجی نہ تھا جیسا کہ ازراہ عادت دیکھا جاتا ہے... اور ابن المنذر (۸۸) نے وہب بن منبه سے نقل کیا ہے کہ حبشی زبان سے ماخوذ اس لفظ کے معنی حیوان کی مانند نکل لینے کے ہیں اور ابوالشیخ (۸۹) نے جعفر بن محمد عن ابیہ کے سند سے نقل کیا ہے کہ ہندی زبان میں اس کے معنی چوس لینے اور پی جانے کے ہیں۔

إبليس

شیطان کا نام ہے برونن إفعیل، إبلاس سے مشتق ہے۔ امام راغب لکھتے ہیں: ”الإبلاس: الخزنُ الْمُتْرَضُ مِنْ شِدَّةِ الْيَأْسِ، وَمِنْهُ اشْتَقَّ إِبْلِيسَ فِيمَا قِيلَ.“ (۹۰) (الإبلاس کے معنی سخت ناامیدی کے باعث غم گین ہو کر ششدر و متحیر ہو جانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ چون کہ شیطان حق تعالیٰ کی رحمت سے نا امید ہے اس لیے اس کا نام ابلیس ہوا۔) ابن عرفہ (۹۱) کی رائے بھی یہی ہے کہ: ”الإبلاس: الحيرة واليأس،

۸۷- سیوطی، الإبتقان، ج ۱، ص ۱۸۰؛ الوسی، روح المعانی، ج ۱۲-۱۱، ص ۳۶۲

۸۸- محمد بن ابراہیم بن منذر نیشاپوری، ابوبکر، فقیہ و مجتہد اور حافظ حدیث تھے۔ مکہ مکرمہ میں شیخ الحرم تھے۔ ۲۴۲ھ / ۸۵۶ء کو پیدا ہوئے۔ ان گنت مفید کتابیں لکھیں ۳۱۹ھ / ۹۳۱ء کو مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔ (ابن خلکان، مرجع سابق، ج ۴، ص ۲۰۷؛ زرکلی، مرجع سابق، ج ۵، ص ۲۹۴)

۸۹- عبداللہ بن محمد بن جعفر بن حبان اصہبانی ابو محمد / ابوالشیخ ۲۷۴ھ / ۸۸۷ء کو پیدا ہوئے۔ حافظ حدیث اور رجال حدیث کے بڑے عالم تھے۔ اپنے دادا حبان کی نسبت سے حَبَّانِي کہلاتے ہیں۔ حصول علم کے لیے موصل، حران، حجاز مقدس اور عراق کے سفر کیے ۳۶۹ھ - ۹۷۹ء کو وفات پائی۔ (حافظ ذہبی، العبر فی من غبر، تحقیق: ابوباجر محمد السعید بن بسبونی زغلول، بیروت، دارالکتب العلمیہ، بدون تاریخ، ج ۲، ص ۱۳۲؛ زرکلی، مرجع سابق، ج ۴، ص ۱۲۰)

۹۰- راغب، المفردات، ص ۶۰

۹۱- علی بن المظفر بن ابراہیم بن عمر بن یزید الوداعی کندی اسکدرانی ثم دمشق ۶۳۰ھ / ۱۲۴۲ء کو پیدا ہوئے۔ ادیب، متفلسف، شاعر اور حدیث و قراءت کے بڑے عالم تھے۔ ۲۰۰ کے قریب آساتذہ سے کسب فیض کیا، اسکدریہ سے تعلق تھا۔ (جاری)

و منه سُمِّيَ إبليس، لأنه أبلس عن رحمة الله أي: أيس منها وتَحَيَّرَ.“^(۹۲) (إبلاس کے معنی حیرت ویاس کے ہیں، ابلیس کا نام بھی اسی سے مشتق ہے، کیوں کہ وہ رحمت الہیہ سے ناامید ہو گیا ہے۔) لیکن زمخشری نے اپنی تفسیر میں لفظ ادربیس پر بحث کرتے ہوئے تصریح کی ہے: ”و كذلك إبليس أعجمي، وليس من الإبلاس كما يزعمون ولا يعقوب من العقب ولا إسرائيل كما زعم ابن السكيت، ومن لم يتحقق ولم يتدرب بالصناعة كثرت منه أمثال هذه الهنات.“^(۹۳) (ابلیس عجمی لفظ ہے اور اس کا اشتقاقِ إبلاس سے بتانا صحیح نہیں، اس لیے کہ یہ غیر منصرف ہے^(۹۴) اور غیر منصرف ہونے کے لیے تو اسباب منع صرف میں سے کم از کم دو سبب یا وہ ایک سبب جو دو سببوں کے قائم مقام ہو، پایا جانا ضروری ہے اور إبلاس سے مشتق ہونے کی صورت میں اس میں سوائے عَلَيَّت کے کوئی دوسرا سبب پایا نہیں جاتا، اس لیے غیر منصرف ہونا اس کے عجمی ہونے کی دلیل ہے۔)

اور ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

فإن قال قائل: فإن كان إبليس، كما قلت، ”إفعيل“ من الإبلاس، فهلا صرف وأجري؟ قيل: ترك إجراؤه استئقالا إذ كان اسما لا نظير له من أسماء العرب، فشبهته العرب - إذ كان كذلك - بأسماء العجم التي لا تجرى. وقد قالوا: مررت بإسحاق، فلم يجزوه. وهو من ”أسحقه الله إسحاقا“، إذ كان وقع مبتدأ اسما لغير العرب، ثم تسمت به العرب فجری مجراه - وهو من أسماء العجم - في الإعراب فلم يصرف. وكذلك ”أيوب“، إنها هو ”فيعول“ من ”آب يؤب.“^(۹۵)

(گذشتہ سے پیوستہ)

رہائش دمشق میں تھی اور وہیں ۱۶۷۱ھ - ۱۳۱۶ء کو وفات پائی۔ (عسقلانی، الدرر الكامنة، ج ۳، ص ۱۳۰؛ زرکلی، مرجع

سابق، ج ۵، ص ۲۳)

۹۲- ہروی، الغریبین فی القرآن والحديث، ص ۲۱۰

۹۳- زمخشری، الکشاف، ج ۳، ص ۲۳-۲۴

۹۴- وہ اسم ہے جو تویین (دوزر، دوزیر اور دو پیش) قبول نہ کرے۔

۹۵- طبری، تفسیر الطبری، ج ۱، ص ۲۶۵

اگر کوئی سوال اٹھائے کہ جب تمہارے قول کے مطابق إبلیس (إفعلیل کے وزن پر) إبلاس سے مشتق ہے تو یہ غیر منصرف کیوں ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عربی لفظ ہے، لیکن ثقیل ہونے کے باعث یہ غیر منصرف ہے اور عربی آسامیں اس کی نظیر و مثال نہ ہونے کی وجہ سے عربوں نے اس سے عجمی اسم کا سا سلوک کر دیا اور اس کے قوانین و احکام اس پر لاگو کر دیے، اسی کی مانند ہیں إسحاق، جو أسحقہ اللہ سے، اور آیوب، جو آب یؤب سے فیعول کے وزن پر ہے۔

جو الیٰقی لکھتے ہیں: ”وإبلیس لیس بعربی وإن وافق أبلس الرجل إذا انقطعت حجته إذ

لو كان منه لُصْرَفَ، ألا ترى أنك لو سميت رجلاً بإخريط وإجفیل لصرفته في المعرفة، ومنهم من يقول: هو عربي، ويجعل اشتقاقه من أبلس يُبلسُ أي: يئس، فكأنه أبلس من رحمة الله أي: يئس منها، والقول هو الأول.“^(۹۶) (إبلیس عربی زبان کا لفظ نہیں اگرچہ أبلس الرجل سے موافقت و مطابقت رکھتا ہے، اس لیے کہ عربی ہونے کی صورت میں منصرف ہوتا جیسا کہ کسی کا نام اگر إخريط یا إجفیل ہے تو معرفہ ہونے کی صورت میں یہ نام منصرف ہوتے ہیں، جب کہ بعض علما کا خیال ہے کہ یہ عربی زبان کا لفظ ہے جو أبلس يُبلسُ بہ معنی ناامیدی سے مشتق ہے اور ان کے خیال میں اس لفظ کو شیطان کے لیے اس لیے استعمال کیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس اور ناامید ہو گیا ہے، لیکن پہلا قول درست ہے کہ یہ عربی زبان کا لفظ نہیں ہے۔) حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ إبلیس عربی زبان کا لفظ نہیں ہے۔^(۹۷)

ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: ”هو يوناني، وأصله دِ يَابُلُس، ومعناه: التمام والعدو والشیطان.“^(۹۸) (یہ یونانی زبان کا لفظ ہے جس کی اصل دِ يَابُلُس ہے اور اس کے معنی چغلی کھانے والا، دشمن اور شیطان کے آتے ہیں۔)

۹۶- جو الیٰقی، المعرب، ص ۱۲۲

۹۷- ابن جوزی، فنون الأفتان، ص ۱۱۵

۹۸- بلاسی، المعرب فی القرآن الکریم، ص ۱۲۲

أَخْلَدَ

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ﴾^(۹۹) (اور اگر ہم چاہتے تو اُس کو اُن آیات کے ذریعے سے بلند کرتے، لیکن وہ زمین ہی کی طرف جھکا اور اپنی خواہشوں ہی کا پیرو بنا رہا۔) سیوطی لکھتے ہیں: ”قال الواسطي في الإرشاد: أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ: رَكَنَ، بالعبرية.“^(۱۰۰) (واسطی نے الإرشاد میں فرمایا ہے کہ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ کے معنی رَكَنَ (جھک جانے) کے ہیں اور یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے۔) اصل میں أَخْلَدَ إِلَى الشَّيْءِ کے معنی کسی شے کی طرف اس طرح جھک جانے اور مائل ہو جانے کے ہوتے ہیں کہ آدمی بس اُسی کا ہو کر رہ جائے۔ یہ اُس سنتِ الہی کا بیان ہے جو اُس نے ہدایت و ضلالت کے معاملے میں پسند فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن کو اپنی آیات سے نوازتا ہے اگر اُن کی عقل کو اُن سے رفعت اور اُن کی روح کو اُن سے معراج حاصل ہوتی ہے لیکن جو لوگ ان آیات کے پانے کے بعد بھی اپنی خواہشوں ہی کے پیچھے اور کتے کی طرح زمین کو سونگھتے ہی ہوئے چلتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو اُن کی خواہشوں ہی کے حوالے کر دیتا ہے اور وہ شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔

إَدْرِيسَ

اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر نبی تھے، اُن کا نام قرآن عزیز میں دوبار آیا ہے: ﴿وَأَذْكُرُ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِذْ كَانَ صَدِيقًا نَبِيًّا﴾^(۱۰۱) ﴿وَلِسَمْعِيلَ وَإِدْرِيسَ وَذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِنَ الصَّالِحِينَ﴾^(۱۰۲) مجد الدین فیروز آبادی لکھتے ہیں: ”واسمہ بالسریانیة خونخ و يُقال أخنوخ، ومعناه كثير العبادة.“^(۱۰۳) (ان کا نام سریانی میں خونخ یا اخنوخ ہے جس کے معنی بہت زیادہ عبادت گزار ہونے کے ہیں۔) یہ بھی کہا گیا ہے کہ:

۹۹- الأعراف: ۱۷۶

۱۰۰- سیوطی، الإنقان، ج ۱، ص ۱۸۰؛ سیوطی، المہذب فی المعرب، ص ۳۵

۱۰۱- مریم: ۴۱

۱۰۲- الأنبياء: ۸۵

۱۰۳- فیروز آبادی، بصائر ذوی التمییز، بیروت، المكتبة العلمية، بدون تاریخ، ج ۶، ص ۵۱

”مشتق من الدرس والدراسة بمعنى القراءة، سمى به لكثرة ما درس من كتب الله عزوجل.“^(۱۰۴) (عربی ہونے کی صورت میں) اس کا اشتقاق درِاسَة سے ہے جس کے معنی پڑھنے، یاد کرنے کے ہیں۔ صحف الہیہ کے مطالعے اور کثرتِ درس و تدریس کی وجہ سے آپ کو ادریس کہا گیا۔ لیکن ز مخشری اسے نادرست کہتے ہیں۔^(۱۰۵) فیروز آبادی کو بھی اعتراف ہے کہ: ”وأما إدریس فإسمٌ عجمیٌّ غیرٌ منصرفٍ.“^(۱۰۶) (ادریس عجمی نام اور غیر منصرف ہے۔) یہ بھی لکھتے ہیں: ”إدریس النبی لیس من الدَّرَاسَة کما توہمہ کثیرون، لأنه أعجمی.“^(۱۰۷) (سیدنا ادریس کا نام درِاسَة (پڑھنے پڑھانے) کی وجہ سے نہیں، جیسا کہ بہت سے لوگوں کو وہم ہوا ہے، اس لیے کہ یہ عجمی لفظ ہے (نہ کہ عربی)۔) ز مخشری کہتے ہیں کہ: ”وهو غیر صحیح لأنه لوکان إفعیلاً من الدرس لم یکن فیہ الإسببُ واحدٌ، وهو العَلَمِیة فکان منصرفاً، فامتناعه من الصَّرف دلیلُ العُجمِة.“^(۱۰۸) (اگر ادریس کو إفعیل وزن پر درس سے مشتق مانا جائے تو اسے منصرف ہونا چاہیے، کیوں کہ اس صورت میں اس میں ایک سبب یعنی علمیت باقی رہتی ہے حالانکہ یہ منصرف نہیں بلکہ غیر منصرف ہے، اس لیے اس کا غیر منصرف ہونا اس کی عجمیت کی دلیل ہے۔) ز مخشری نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ: ”ویجوز أن یکون معنی إدریس فی تلك اللغة قریباً من ذلک فحسبه الراوی مشتقاً من الدرس.“^(۱۰۹) (ممکن ہے ادریس جس زبان کا لفظ ہو اسی زبان میں اس کے معنی درس و دراست سے ملتے جلتے ہوں، جس سے راوی نے اس کو درس سے مشتق خیال کر لیا ہو۔)

۱۰۴- فیروز آبادی، نفس مصدر، ج ۶، ص ۵۱؛ ابن منظور، لسان العرب، بہ ذیل مادہ: ”درس“

۱۰۵- ز مخشری، مصدر سابق، ج ۳، ص ۲۳

۱۰۶- فیروز آبادی، مصدر سابق، ج ۶، ص ۵۱

۱۰۷- فیروز آبادی، القاموس المحيط، بہ ذیل مادہ: ”درس“

۱۰۸- ز مخشری، مصدر سابق، ج ۲، ص ۲۳

۱۰۹- ز مخشری، مصدر سابق، ج ۳، ص ۲۳، قرطبی، تفسیر القرطبی، ج ۱۱، ص ۱۰۸

أرائك

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿هُم وَأَزْوَاجُهُمْ فِي ضَلَالٍ عَلَى الْأَرَائِكِ مُتَّكِنُونَ﴾^(۱۱۰) (وہ بھی اور ان کے جوڑے بھی سایوں میں تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔) أَرَائِكِ، أَرِيكَةُ کی جمع ہے۔ تخت، چارپائی اور مسہری کو کہتے ہیں جس پر پردے پڑے ہوئے ہوں اور ہر وہ چیز جس پر ٹیک لگائی جائے۔ راغب لکھتے ہیں: ”لأريكة: حجلة على سرير، جمعها: أرائك، وتسميتها بذلك إما لكونها في الأرض متخذة من أراك، وهو شجرة، أو لكونها مكانا للإقامة من قولهم: أرك بالمكان أروكا. وأصل الأروك: الإقامة على رعي الأراك، ثم تجوز به في غيره من الإقامة.“^(۱۱۱) (مسہری اور چھپر کھٹ کو أريكة کہتے ہیں، اس لیے کہ وہ بالعموم أراك (پیلو) کی لکڑی سے بنایا جاتا تھا اور یا اس لیے کہ یہ أرك بالمكان أروكا سے مشتق ہے جس کے اصل معنی الأروك کے ہیں یعنی کسی جگہ پر أراك (پیلو) کے پتے چرنے کے لیے ٹھہرنے کے ہیں، پھر مطلق ٹھہرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔)

رہی یہ بات کہ یہ کس زبان سے آیا؟ اس سلسلے میں ابن جوزی لکھتے ہیں: ”وَبَلْغَةَ الْحَبَشِيِّ... الأرائك: السُّرُر.“^(۱۱۲) (حبشی زبان میں أرائك کے معنی تختوں کے ہیں۔) سیوطی لکھتے ہیں: ”حکى ابن الجوزي في فنون الأفتان أنها السُّرُرُ بالحبشية.“^(۱۱۳) (ابن جوزی نے فنون الأفتان میں نقل کیا ہے کہ حبشی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی تخت کے ہیں۔) خطیب شربنی^(۱۱۴) لکھتے ہیں: ”روى أبو عبيدة في الفضائل عن الحسن قال: كُنَّا لاندري ما الأرائك حتى لقينا رجلاً من أهل اليمن فأخبرنا

۱۱۰- یس: ۵۶

۱۱۱- راغب اصفہانی، المفردات، ص ۱۶

۱۱۲- ابن جوزی، فنون الأفتان، ص ۱۱۸

۱۱۳- سیوطی، الإتقان، ج ۱، ص ۱۸۰

۱۱۴- محمد بن احمد شربنی، شمس الدین، شافعی فقیہ اور مفسر قرآن تھے۔ قاہرہ سے تعلق تھا۔ کئی علمی کتابوں کے مصنف ہیں۔

۱۵۷۰ھ - ۱۵۷۰م کو وفات پائی۔ (دمشقی، شذرات الذهب، ج ۸، ص ۴۸۲؛ ذہبی، سیر أعلام النبلاء، ج ۶، ص ۶)

أن الأريكة عندهم الحجلة فيها السرير. وهذا جزء لما كانوا يلزمون المساجد ويغضون
 أبصارهم و يضعون نفوسهم لأجلنا.“^(۱۱۵) (ابوعبیدة نے فضائل میں حسن بصری کے حوالے سے نقل
 کیا ہے کہ ہم ارائک کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے یہاں تک کہ ہمارے پاس ایک یعنی شخص آیا، اُس نے
 ہمیں بتایا کہ اُن کے ہاں جملہ عروسی میں بچھی ہوئی پلنگ کو اریکہ کہا جاتا ہے اور یہ اُن لوگوں کی جزا ہے جو بہ کثرت
 مساجد میں آتے جاتے اور اپنی نگاہوں اور شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔) ثعلب کہتے ہیں کہ: ”الأريكة
 لاتكون إلا سريرًا مُتَّخِذًا فِي قُبَّةٍ عَلَيْهِ شَوَارُهُ وَنَجْدُهُ.“^(۱۱۶) (الأريكة کے معنی مزین تخت کے ہیں
 جو قُبَّة (جملہ عروسی) کے اندر ہو اور جس پر پردہ لٹکا ہوا ہو۔)

ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: ”واحدھا اریکہ، وہی السریر المنجد، الفرش الجمیل۔ والكلمة
 فارسیة مركبة من آرا: زينة، ونیک: جمیل، ویلفظونها: اورنگ۔“^(۱۱۷) اس کا مفرد اریکہ ہے، جو آراستہ و
 پیراستہ چھپر کھٹ کو کہتے ہیں، جس پر خوب صورت مسہری ہو، جو آرا اور نیک سے مرکب ہے، وہ اورنگ سے اس
 کا تلفظ کرتے ہیں۔

أَسَاطِيرُ

سَطْرَيْسَطْرُ سَطْرًا سے ہے۔ اہل لغت نے اس کے بنیادی معنی یہ کیے ہیں: ”السطر: الصَّفُّ
 من الشيء كالكتاب والشجر والنخل.“^(۱۱۸) (کسی شے کا صف بند (سیدھی لائنوں میں) ہونا، جیسے
 کتاب کی سطور اور درختوں اور کھجوروں کی لائن۔) یہ لفظ جمع کی صورت میں قرآن مجید میں نوجہ مستعمل ہے۔
 سورة الأنعام: ۲۵، سورة الأنفال: ۳۱، سورة النحل: ۲۲، سورة المؤمنون: ۸۳، سورة الفرقان: ۵،

۱۱۵- ثریبی، تفسیر سراج المنیر فی الإعانة علی معرفة بعض کلام ربنا الحکیم الخیر، بیروت، دارالکتب

العلمیة، ۱۴۲۹ھ-۲۰۰۸ء، ج ۳، ص ۴۳۵

۱۱۶- ابوالحسین احمد بن فارس بن زکریا رازی، مجمل اللغة، کتاب الألف، باب الألف والراء، وما یشلھما

۱۱۷- تونجی، المعرب والدخیل، ص ۱۹۲

۱۱۸- زبیدی، تاج العروس، بہ ذیل مادہ: ”س ر ط“

سورة النمل: ۶۸، سورة الاحقاف: ۱۷، سورة القلم: ۱۵ اور سورة المطففين: ۱۳۔ ڈاکٹر محمد تونسجی لکھتے ہیں: ”واحدھا أسطورةً بمعنی القصة والحکایة، من اليونانية Histori أي: تاریخ، وعربت بالأباطیل من الأحادیث.“^(۱۱۹) (اس کا واحد أسطورةً ہے، جس کے معنی حکایت، قصہ اور کہانی کے ہیں۔ یونانی زبان کے Histor سے ہے جس کے معنی تاریخ کے ہیں، لیکن یہ معرب ہو کر اپنے معنوں میں نہ رہا، بلکہ عربی زبان میں یہ جھوٹے واقعات، کہانیوں اور افسانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔)

أسباط

اس مادے کا بنیادی معنی کسی چیز کے دراز ہونے کے ہیں، چناں چہ اہل لغت نے لکھا ہے: ”أسبَطَ الرجلُ إسباطاً: إذا امتدَّ وانبسطَ على الأرضِ من الضَّرْبِ.“^(۱۲۰) (أسبَطَ الرجلُ إسباطاً: اُس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی زمین پر کسی کے مارنے سے لیٹ کر دراز ہو جائے۔) مرتضیٰ زبیدی لکھتے ہیں: ”السَّبَطُ: الشجرة لها أغصانٌ كثيرةٌ وأصلها واحدٌ، ومنه اشتقاقُ الأسباط، كأنَّ الوالدَ بمنزلةِ الشجرةِ والأولادَ بمنزلةِ أغصانها.“^(۱۲۱) (السَّبَطُ ایک درخت یا جھاڑی کو کہتے ہیں جس کی جڑ تو ایک ہوتی ہے لیکن شاخیں بہت پھیلی ہوئی ہوتی ہیں، یہیں سے اس کے معنی نسل اور خاندان کے ہو گئے ہیں، یعنی باپ بمنزلہ جڑ کے ہے اور اولاد بمنزلہ شاخوں کے۔ أسباطٌ، سبَطٌ کی جمع ہے، پوتے اور نواسے دونوں کو کہتے ہیں مگر نواسے کے معنی میں اس کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ ازہری لکھتے ہیں: ”أَنَّ الأسباطَ في ولدِ إسحقَ بمنزلةِ القبائلِ في ولدِ إسمعیلِ فولدِ كلِّ ولدٍ من أولادِ إسحقَ سبَطٌ و ولدِ كلِّ ولدٍ من أولادِ إسمعیلِ قبيلةٌ، وإنما سُمُّوا هؤلائی بالأسباطِ وهؤلاء بالقبائلِ لِيُفصَلَ بين ولدِ إسمعیلِ و

۱۱۹- تونسجی، المعرب والدخیل، ص ۱۹۲

۱۲۰- ازہری، تہذیب اللّغة، باب السین و الطاء مع اللّام؛ ابوالحسین احمد بن فارس بن زکریا رازی، مجمل اللّغة،

باب السین و الباء وما یشثہما

۱۲۱- زبیدی، مرجع سابق، فصل السین المہلمة مع الطاء، س ب ط

ولد إسحق عليهما السلام.“^(۱۲۲) (سیدنا اسحاق کی اولاد کے لیے اسباط کا لفظ اس طرح مستعمل ہے، جیسا کہ سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کے لیے قبائل کا لفظ مستعمل ہے۔ عربوں نے یہ تخصیص اس لیے رکھی تھی کہ محض ایک لفظ سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کی دونوں شاخوں: بنو اسحاق اور بنو اسماعیل میں امتیاز ہو جائے۔) ڈاکٹر محمد تونسجی لکھتے ہیں کہ اسباط عبرانی زبان کا لفظ ہے۔^(۱۲۳) قرآن مجید میں یہ لفظ ان مقامات میں وارد ہے: سورۃ

البقرۃ: ۱۳۶، ۱۴۰، سورۃ آل عمران: ۸۴، سورۃ النساء: ۱۶۲ اور سورۃ الأعراف: ۱۶۰

اِسْتَبْرَق

یہ لفظ قرآن مجید میں چار مقامات پر آیا ہے: سورۃ الکہف: ۳۱، سورۃ الدخان: ۵۳، سورۃ الرحمن: ۵۴ اور سورۃ الدھر: ۲۱۔ جوایتی لکھتے ہیں کہ: ”والإستبرق: غلیظ الدیاج، فارسی معرّب، وأصله: اِسْتَفْرَة.“^(۱۲۴) (ریشم کا دبیز کپڑا اِسْتَبْرَق کہلاتا ہے، یہ فارسی سے عربی میں در آیا ہے، اس کی اصل اِسْتَفْرَة ہے۔) ابن جوزی، زرکشی، سیوطی اور ڈاکٹر صلاح الدین منجد اسے فارسی سے معرب مانتے ہیں۔^(۱۲۵) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں کہ: ”أصله بالفارسية الجديدة سِتْبَرُ أو اِسْتَبْر، ومعناه الغليظ، ثم حُصَّ بغليظ الدياج، وهو بالفهلوية: “Stawr، Stapr.“^(۱۲۶) (جدید فارسی میں اس کی اصل سِتْبَرُ یا

۱۲۲- ازہری، تہذیب اللغة، ج ۱۲، ص ۲۴۰

۱۲۳- ڈاکٹر تونسجی، المعرب والدخیل، ص ۱۹۲

۱۲۴- جوایتی، المعرب، ص ۱۰۸

۱۲۵- ابن جوزی، فنون الأفتان، ص ۱۱۸؛ زرکشی، البرہان فی علوم القرآن، ج ۱، ص ۲۸۸؛ سیوطی، الإنقان، ج ۱، ص

۱۸۰؛ سیوطی، المہذب فی المعرب فیما وقع فی القرآن من المعرب، ص ۱۰۶؛ صلاح الدین المنجد، المفصل فی

الألفاظ الفارسیة المعربة، ص ۸۳-۸۴

۱۲۶- جوایتی، المعرب، ص ۱۰۸؛ ڈاکٹر محمد تونسجی لکھتے ہیں: ”نری هؤلاء السادة العلماء لا يتقبلون كلمة ديياج أن

يكون أصلها الپهلوي مركبًا من: ديو: الشيطان، وباف: نسج من المصدر بافتن، والمعنى الأصلي

هو نسج الشيطان، ثم صار المعنى: نوعٌ من الحرير الفاخر، والتي عبرت بمعنى الحرير الغليظ، (جاری)

اِسْتَبْرَہے، جس کے معنی سخت و دبیز ہونے کے ہیں، پھر دبیز ریشم کے لیے اس کا استعمال ہونے لگا۔ پہلوی زبان میں اسے Stawr، Stapr کہتے ہیں۔)

إِسْحَاق

جواہری لکھتے ہیں: ”وإِسْحَاقُ أَعْجَمِيٌّ وَإِنْ وَافَقَ لَفْظَ الْعَرَبِيِّ، وَيُقَالُ: أَسْحَقَهُ اللَّهُ يُسْحِقُهُ إِسْحَاقًا.“^(۱۲۷) إسحاق عجمی ہے اگرچہ عربی سے موافق و مشابہ ہے۔ کہا جاتا ہے: ”أَسْحَقَهُ اللَّهُ يُسْحِقُهُ إِسْحَاقًا“ (عربی کے اسحاق کے معنی دور کرنے اور ہلاک کرنے کے ہیں۔) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: ”ہو بالعبرية، يصحاق، وورد في التوراة بالسين أيضًا، و معناه: يضحك. وجعله بعضهم إنشاءً بمعنى: لِيَبْتَسِمَ، بتقدير إيل.“^(۱۲۸) (عبرانی میں یہ ”يصحاق“ ہے اور تورات میں اسحاق بھی وارد ہے، اس کے معنی خوش و خرم کے ہیں۔ کچھ علما کا خیال ہے کہ یہ انشائی نام ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اسے خوش و خرم رکھے۔) آپ یہ بھی لکھتے ہیں: ”والهمزة في أول الكلمة بدلًا من الياء كما في العبرية تدلُّ على كونه أدخلت في العربية من السريانية فهي فيها إسحاق.“^(۱۲۹) (اس کی ابتدا میں یا کے بجائے ہمزہ کی موجودگی اس بات کی غماز ہے کہ یہ سریانی سے عربی میں در آیا ہے، اس لیے کہ سریانی میں اس کی املا، إسحاق ہے۔) سیوطی نے ابوعلی مسکویہ کی کتاب ندیم الفرید کے حوالے سے لکھا ہے: ”أَنَّ مَعْنَى إِسْحَاقِ“

(گذشتہ سے پیوستہ)

واشتق منها الفعل دَبَّحَ بمعنى: نَقَّشَ، والديباجة: المقدمة الأدبية للرسائل وبعض الموضوعات.“ (بعض علمائے اعلام کو اس میں تامل ہے کہ دیباج کو پہلوی زبان کے دیوباف کا معرب مانا جائے، جس کے معنی ہیں: شیطان کا بُنا ہوا اور پھر اسے قیمتی ریشم کے لیے استعمال کیا گیا ہو اور اس سے دَبَّحَ بمعنی نَقَّشَ مشتق ہوا ہے۔ مکہ اور دیباج اس ادبی مقدمے کو کہتے ہیں جو اور دیباجہ نکلا ہو جسے کتابوں اور رسالوں کی ابتدا میں ہوتا ہے۔) (توئجی، المعرب و الدخیل،

ص ۶۵)

۱۲۷- جواہری، مصدر سابق، ص ۱۰۶

۱۲۸- جواہری، مرجع سابق، ص ۱۰۶

۱۲۹- جواہری، مصدر سابق، ص ۱۰۶

بالعبرانية: الضحاک“^(۱۳۰) (عبرانی میں اسحاق کے معنی سَحَّاک (ہنسنے والا، خوش و خرم) کے ہیں۔) اسحاق کے غیر منصرف ہونے کی ایک وجہ عَلَیَّت ہے دوسرے مُجْمَر۔

أسرائیل

سیدنا یعقوب عَلَیْهِ السَّلَام کا عبرانی نام تھا، اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے یہود کے ایک گروہ سے پوچھا تھا کہ: ”هل تعلمون أن إسرائيل يعقوب؟“^(۱۳۱) (کیا تم جانتے ہو کہ اسرائیل یعقوب ہی تھے۔) سہیلی لکھتے ہیں: ”وسمی اسرائیل لأنه أسري ذات ليلة حين ها جر إلى الله سبحانه فسمي إسرائيل: أي: سري الله، فيكون بعض الإسم عبرانياً وبعضه سريانياً.“^(۱۳۲) (اسرائیل کے معنی ہیں: رات کی تاریکی میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے ہجرت کرنے والا، اس نام کا ایک حصہ عبرانی ہے اور دوسرا سریانی۔) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں:

هو بالعبرية، إسرائيل، قيل معناه: يحارب الله وقال فيليب حيتي في تاريخ سورية ولبنان وفلسطين (۱۹۱:۱) إن معناه ليحككم إيل، أو إيل يحكمكم، ووجود الهمزة في أول الكلمة بدلاً من الياء في العبرية يدل على كونه دخل في العربية عن طريق السريانية فهو فيها إسرائيل.^(۱۳۳) یہ عبرانی زبان میں یسرائیل پڑھا جاتا ہے، جس کے معنی یحارب اللہ کے ہیں۔ فلپ حیتی (Phillippe Hitti) نے تاریخ سوریا، لبنان اور فلسطین میں لکھا ہے کہ ”اس کا معنی لیحکمکم إیل یا إیل یحکمکم ہے۔“ اس کی ابتدا میں یا

۱۳۰- سیوطی، الإیتقان، ج ۲، ص ۱۷۶

۱۳۱- احمد بن حنبل، مسند الإمام أحمد بن حنبل، مسند عبد الله بن العباس بن عبدالمطلب؛ ابو داؤد سلیمان بن داؤد بن جارود طرابلسی، مسند أبي داود الطيالسي، وما أسند عبدالله بن العباس بن عبدالمطلب وشهد بن حوشب، حدیث: ۲۸۵۳

۱۳۲- ابو القاسم عبدالرحمان بن عبداللہ سہیلی، التعریف والأعلام فیما أبهم من الأسماء والأعلام في القرآن الکریم، ص ۲۰

۱۳۳- عبدالرحیم، المعرب، ص ۱۰۷

کے بجائے ہمزہ کی موجودگی اس بات کی غماز ہے کہ یہ سریانی سے عربی میں در آیا ہے، اس لیے کہ سریانی میں اس کا املا اسرائیل ہے۔

الْأَسْفَارُ

﴿مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا﴾^(۱۳۳) (أَنْ) لوگوں کی تمثیل جن پر تورات لادی گئی پھر انھوں نے اس کو نہ اٹھایا اُس گدھے کی ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ ابن ابی حاتم ضحاک کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ: ”أَسْفَارُ“ کے معنی نبطی زبان میں کتابوں کے ہیں۔“^(۱۳۴) کرمانی لکھتے ہیں: ”جمعِ سِفْرٍ، وهو الكتابُ يكشف عن المعنى كما تسفر المرأة وجهها وهو نبطي، وهو قول الضحاک.“^(۱۳۶) (أَسْفَارُ، سِفْرٌ کی جمع ہے۔ کتاب کو کہا جاتا ہے اس لیے کہ وہ مطا لب و معانی اور حقائق کو ظاہر کرتی ہے جیسا کہ عورت اپنا چہرہ ظاہر (کر کے اپنا حسن و جمال ظاہر) کرتی ہے۔ ضحاک کہتے ہیں کہ یہ نبطی زبان کا لفظ ہے۔) سیوطی نے واسطی کی کتاب الإرشاد کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ سریانی زبان میں کتاب کو کہا جاتا ہے۔^(۱۳۷)

اس آیت نے یہود کے پندار پر ضرب لگائی ہے کہ اگر وہ اس گھنڈ میں مبتلا ہیں کہ کتاب و شریعت کے حامل وہی ہو سکتے ہیں، کوئی دوسرا اس شرف میں اُن کا حریف نہیں ہو سکتا، تو یہ گھنڈ اب وہ اپنے دماغ سے نکال دیں۔ اب اُن کی مثال اُس گدھے کی ہے جو کتابوں کا بوجھ تو اٹھائے ہوئے ہے لیکن اُسے کچھ خبر نہیں کہ ان کتابوں میں کیا ہے۔

﴿حَمَلُوا التَّوْرَةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا﴾ یعنی اس میں تو شبہ نہیں کہ ایک زمانے میں ان کے اوپر تورات کا بوجھ لادا گیا، لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ہے کہ انھوں نے اس بارگراں کو اٹھایا نہیں، اس نہ اٹھانے کی

۱۳۳- الجمعة: ۵

۱۳۴- ابن ابی حاتم، تفسیر ابن ابی حاتم، ج ۱۰، ص ۳۳۵

۱۳۶- محمود بن حمزہ کرمانی، غرائب التفسیر و عجائب التأویل، ت: شمران سرکال یونس علی، جدہ، دار القبلة للثقافة

العربية، ۱۴۰۸ھ-۱۹۸۸ء، ج ۲، ص ۱۲۱۱

۱۳۷- سیوطی، الإنقان، ج ۱، ص ۱۸۰؛ المهذب، ص ۳۹

وضاحت کذبِ ابائتِ اللہ کے الفاظ سے فرمادی گئی کہ تورات کی تعلیمات اور اس کے احکام پر ان کا ایمان باقی نہیں، عملاً انھوں نے ان کی تکذیب کر دی۔ ظاہر ہے کہ جب ان کتابوں کے احکام کی انھوں نے تکذیب کر دی تو ان کے اجر سے تو وہ محروم ہو گئے، صرف ان کا گناہ ان کے سر پر باقی رہا اور وہ اس مثل کے مصداق ہیں کہ

حپارپائے برو کتابے چند

إِسْمَاعِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ

جوالیقی لکھتے ہیں: ”وإِسْمَاعِيلُ فِيهِ لَغْتَانٌ: إِسْمَاعِيلُ وَإِسْمَعِيلُ.“^(۱۳۸) (اس میں دو لغتیں ہیں: اسماعیل اور اسماعیلین۔) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: ”وإِسْمَعِيلُ - بالنون - هي اللغة الجارية على ألسنة أهل مصر الآن.“^(۱۳۹) (اہل مصر کے ہاں اسماعیلین آج کل زبان زد ہے۔) خفاجی لکھتے ہیں: ”قال السبكي أن معناه: عطية الله، وقال صاحب القاموس إن معناه: مُطِيعُ الله، وليس صحيحين.“^(۱۴۰) (سبکی نے کہا ہے کہ اس کے معنی عطیۃ اللہ کے ہیں، صاحب قاموس (مجدالدین فیروز آبادی)^(۱۴۱) نے کہا ہے کہ اس کے معنی، مطیع اللہ ہیں، مگر یہ دونوں قول نادرست ہیں۔) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: ”أصله يَشْمَعُ إيل، وهو مكوّنٌ من يَشْمَعُ أي: يسمع، وإيل: الله.“^(۱۴۲) (اس کی اصل يَشْمَعُ إيل ہے، يَشْمَعُ کے معنی سننے اور فرمان برداری کرنے کے ہیں، جب کہ ایل کے معنی اللہ کے ہیں۔) جوالیقی نے لکھا ہے کہ اس کی اصل

۱۳۸ - جوالیقی، المعرب، ص ۱۰۵

۱۳۹ - عبدالرحیم، المعرب، ص ۱۰۵

۱۴۰ - شہاب الدین احمد بن محمد بن عمر خفاجی، شفاء الغلیل فیما فی کلام العرب من الدخیل، بیروت، دارالکتب

العلمیة، ۱۴۱۸ھ - ۱۹۹۸ء، ص ۳۳

۱۴۱ - القاموس المحیط، بہ ذیل: فصل السین

۱۴۲ - عبدالرحیم، المعرب، ص ۱۰۵

اشماویل ہے۔^(۱۳۳) مگر ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: یہ قول صحیح نہیں، یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے، جس میں عین کے بعد ہمزہ ہے... اور عربی میں یہ لفظ سریانی کے راستے داخل ہوا ہے۔^(۱۳۴)

إِصْرِي

قرآن مجید میں وارد ہے: ﴿قَالَ أَأَقْرَضْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي﴾^(۱۳۵) (پوچھا کہ بھلا تم نے اقرار کیا اور اس اقرار پر میرا ذمہ لیا (یعنی: مجھے ضامن ٹھہرایا)۔) ابن جریر نے إصري کا ایک معنی عہدی کیا ہے۔^(۱۳۶) سیوطی لکھتے ہیں کہ: ”قال أبو القاسم في لغات القرآن: معناه عهدي، بالنبطية.“^(۱۳۷) (ابو القاسم نے لغات القرآن میں کہا ہے کہ نبطی زبان میں إصْر عہد کے معنی میں ہے۔) ڈاکٹر محمد تونسجی لکھتے ہیں: ”یہ نبطی لفظ ہے۔“^(۱۳۸)

أَكْوَابٌ

قرآن مجید میں ہے: ﴿يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَأَكْوَابٍ﴾^(۱۳۹) (ان پر سونے کی پرچوں اور پیالوں کا دور چلے گا۔) اکْوَابٌ، کُوبٌ جمع ہے، اور اس سے مراد ایسا پیالہ ہے جس کا دستہ نہ ہو۔ مفسر ابن جریر نے ضحاک کے حوالے سے لکھا ہے کہ: ”الأكوابُ جرار ليست لها عُرْيٌ، وهي بالنبطية كوبا.“^(۱۴۰) (اکواب ایسے پیالے ہیں جن کے دستہ نہ ہوں، نبطی میں اسے کوبا کہتے ہیں۔) ابن جوزی نے اس

۱۳۳- جوالیقی، المغرب، ص ۹۵

۱۳۴- عبدالرحیم، مرجع سابق، ص ۱۰۵

۱۳۵- ال عمران: ۴۱

۱۳۶- ابن جریر، تفسیر الطبري، ج ۳، ص ۳۳۲

۱۳۷- سیوطی، الإلتقان، ج ۱، ص ۱۸۰؛ المهذب، ص ۴۰

۱۳۸- تونسجی، المغرب والدخيل، ص ۱۹۳

۱۳۹- الزخرف: ۷۱

۱۴۰- ابن جریر، مصدر سابق، ج ۱۱، ص ۶۳۰

کی اصل نبطی زبان کی اکواز تسلیم کیا ہے۔^(۱۵۱) ڈاکٹر محمد تونسجی لکھتے ہیں: ”واحدھا کوْب، وھوالکوز المستدیر الرأس، لأعروة له، فارسیة.“^(۱۵۲) (اس کا واحد کوْب ہے، اُس بے دست کوزے کو کہا جاتا ہے، جس کا سراگول ہو، یہ فارسی لفظ ہے۔) ڈاکٹر محمد تونسجی لکھتے ہیں: ”واختلفوا فی أصلھا فمن ھم من رآھا یونانیة من Kybos، أولاتینية من Kupa.“^(۱۵۳) (اس کے اصل کے بارے میں محققین کے مابین اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یونانی زبان میں اس کی اصل Kybos ہے جب کہ بعض کے نزدیک یہ لاطینی زبان کے Kupa سے ماخوذ ہے۔)

أَلِیْمٌ

ابن جوزی لکھتے ہیں کہ اَلِیْمٌ سے ماخوذ یہ لفظ درد کے معنی میں مستعمل ہے، جوزنج سے زبان سے تعلق رکھتا ہے۔^(۱۵۴) سیوطی نے بھی ابن جوزی کے حوالے سے یہ بات لکھ کر شیدلہ کے حوالے سے اسے عبرانی زبان سے ماخوذ تسلیم کیا ہے۔^(۱۵۵) ڈاکٹر محمد تونسجی لکھتے ہیں: ”وَنُرَجِّحُ عربیتھا.“^(۱۵۶) (ہمارے نزدیک اس کا عربی ہونا راجح ہے۔)

الْإِلُّ

امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں: ”الْإِلُّ ھو اللہ عزوجل، وعن أبی بکر الصدیقؓ أَنَّهُ لَمَّا سَمِعَ ھذیان مسیلمة قال: إِنَّ ھذا الکلام لم یخرج من إِلِّ.“^(۱۵۷) (یہ اللہ عزوجل کا نام ہے۔ سیدنا

۱۵۱- ابن جوزی، فنون الأفتان، ص ۱۱۷؛ سیوطی، الإیتقان، ج ۱، ص ۱۸۰

۱۵۲- تونسجی، المعرب والدخیل، ص ۱۹۳

۱۵۳- تونسجی، نفس مرجع، ص ۲۰۳

۱۵۴- ابن جوزی، فنون الأفتان، ص ۱۱۸

۱۵۵- سیوطی، مرجع سابق، ج ۱، ص ۱۸۰؛ المہذب، ص ۴۰

۱۵۶- تونسجی، مرجع سابق، ص ۱۹۳

۱۵۷- فخر الدین رازی، التفسیر الکبیر، بیروت، دار إحیا التراث العربی، ۱۴۱۷ھ- ۱۹۹۷ء، ج ۵، ص ۵۳۲

ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ جب مسیلمہ کذاب کا ہذیان آپ کے گوش گزار ہوا تو فرمایا: یہ کلام اللہ تعالیٰ سے سرزد نہیں۔) اور یہ مجاہد کی رائے بھی ہے: ”الإلُّ هو الله تعالیٰ، قال مجاهد في قوله سبحانه: ﴿لَا يَرْفُقُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلَّا وَلَا ذِمَّةً﴾^(۱۵۸) لیکن: ”وطعن الزجاج في هذا القول وقال: أسماء الله معلومة من الأخبار والقرآن، ولم يسمع أحد يقول: يا إله.“^(۱۵۹) (زجاج نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسما قرآن مجید اور احادیث نبویہ کے ذریعہ معلوم ہیں، جن میں یہ نام مذکور نہیں، نیز ہم نے کسی شخص کو یا اِلُّ کہتے نہیں سنا گیا۔) امام رازی نے ازہری کے حوالے سے لکھا ہے: ”أيل من أسماء الله عز وجل بالعبرانية، فجائز أن يكون عَرَبَ.“^(۱۶۰) (عبرانی زبان میں ”ایل“ اسماء الہیہ میں سے ہے، اس لیے اس کا معرب ہونا درست ہے۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: ”الإلُّ: الله تعالیٰ، عبرية ونبطية، و EL: الله في معظم الساميات.“^(۱۶۱) (عبری اور نبطی زبان میں اللہ تعالیٰ کے لیے الإلُّ استعمال کیا جاتا ہے اور اکثر سامی زبانوں میں EL، اللہ تعالیٰ کے لیے مستعمل ہے۔)

إنجيل

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب کا نام ہے، جس کا ذکر قرآن مجید میں بارہ مقامات پر کیا گیا ہے: سورة آل عمران: ۳، ۴۸، ۶۵؛ سورة المائدة: ۴۶، ۴۷، ۶۶، ۶۸، ۱۱۰؛ سورة الأعراف: ۱۵۷؛ سورة التوبة: ۱۱۱؛ سورة الفتح: ۲۹؛ سورة الحديد: ۲۷۔ جو ایلی لکھتے ہیں:

والإنجيل أعجمي معرب، وقال بعضهم: إن كان عربياً فاشتقاقه من النَّجْلِ، وهو ظُهور الماء على وجه الأرض واتساعه، وَنَجَلْتُ الشيء: إذا استخرجته وأظهرته، فالإنجيلُ مستخرجٌ به علوم و حکم، وقيل: هو إفعيل، من النَّجْلِ، وهو الأصل، فالإنجيلُ أصلٌ لعلومٍ وحكَمٍ.^(۱۶۲)

۱۵۸- التوبة: ۱۰؛ ابو محمد عبداللہ بن مسم بن قتیبة، تأویل مشکل القرآن، قاہرہ، دار التراث، ۱۳۹۳ھ - ۱۹۷۲ء، ص ۴۹

۱۵۹- رازی، مصدر سابق، ج ۵، ص ۵۳۲

۱۶۰- رازی، مصدر سابق، ج ۵، ص ۵۳۲

۱۶۱- تونجی، مرجع سابق، ص ۱۹۳

۱۶۲- جو ایلی، المعرب، ص ۱۲۳

انجیل عجمی اور معرب ہے۔ بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ عربی ہونے کی صورت میں اس کا اشتقاق النَّجْل سے ہے، جس کے معنی روئے زمین پر پانی ظاہر ہو جانے اور اس کے پھیلنے کے ہیں اور نَجَلْتُ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو ظاہر کرنے کے ہیں۔ علم و حکمت کا خزانہ اور اس کی اصل و اساس ہونے کی بنا پر یہ آسمانی کتاب انجیل کہلاتی ہے۔ ابن فارس کہتے ہیں: ”والإنجيل: هذا الكتاب، قيل: هو من نَجَلْتُ، أي: استخرجت“ (۱۶۳)

(انجیل، نَجَلْتُ الشَّيْءَ سے ہے، جس کے معنی ہیں: میں نے اسے نکال لیا، یعنی واضح کر دیا۔) ابن سیدہ اور ابن منظور افریقی نے قیل کہہ کر اس کا اشتقاق نجل سے مان کر اس کے معنی اصل کے کیے ہیں۔ (۱۶۴) ابن منظور نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ عبرانی یا سریانی کا لفظ ہے۔ (۱۶۵) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: ”ہو یونانی... ومعناه اللغوي: البشري، ومنه بالإيطالية Evangelio وبالألمانية: Evangelium“ (۱۶۶) (یہ یونانی لفظ وَنَجَلِيُونُ کا معرب ہے، جو اٹالین زبان میں Evangelio اور المانی میں Evanglium ہے۔)

بعض کا خیال ہے کہ انجیل عربی زبان کا لفظ ہے۔ زمخشری نے ان کے جواب میں لکھا ہے: ”إسمان أعجميان، وتكلمت اشتقاقها من الوري والنجل، ووزنها بتفعلة وأفعال إنما يصح بعد كونها عربيين، وقرأ الحسن: الإنجيل، بفتح الهمزة، وهو دليل على العجمية، لأن أفعال بفتح الهمزة - عديم في أوزان العرب.“ (۱۶۷) (تورات اور انجیل دونوں عجمی لفظ ہیں۔ تکلف سے کام لے کر ان کا اشتقاق وَرِيٌّ اور نَجْلٌ سے بتانا اور ان کا وزن تَفْعَلَةٌ اور إِفْعِيلٌ بیان کرنا اُس وقت صحیح ہو سکتا ہے جب کہ یہ دونوں لفظ عربی ہوں۔ حسن بصری نے اس کی قراءت اَنْجِيلٌ کی ہے جس میں فتح

۱۶۳- ابن فارس، مجمل اللغة، كتاب النون، باب النون والجيم وما شلشهما

۱۶۴- ابن سیدہ، المحکم والمحیط الأعظم، حرف الجيم، الجيم و اللام و النون، مقلوبة: ن ج ل؛ ابن منظور

افریقی، لسان العرب، بذیل: ”ل“، فصل النون، ج ۱۴، ص ۵۸

۱۶۵- ابن منظور افریقی، نفس مصدر و مادہ

۱۶۶- جویلی، مرجع سابق، ص ۱۲۳

۱۶۷- زمخشری، الکشاف، ج ۱، ص ۳۳۵-۳۳۶

کو ہمزہ ہے یہ اس کے عجمی ہونے کی دلیل ہے کیوں کہ اَفْعِيلٌ کا فتح ہمزہ کے ساتھ سرے سے اوزانِ عرب میں وجود ہی نہیں ہے۔)

اَوَابٌ

ابن حاتم نے سیدنا عمرو بن شرحبیل کے حوالے سے لکھا ہے کہ حبشی زبان میں اس کے معنی الْمُسَبِّحُ (تسبیح بیان کرنے والے) کے ہیں۔^(۱۶۸) ڈاکٹر محمد تونسجی لکھتے ہیں: ”الْاَوَابُ، الْمُسَبِّحُ بِلِسَانِ الْحَبَشَةِ۔ اَوْ مِنْ الْاَوَابِ.“^(۱۶۹) (الْاَوَابُ: حبشی زبان میں اس کے معنی تسبیح پڑھنے والے کے ہیں۔) قرآن مجید میں سیدنا داؤد، سیدنا سلیمان اور سیدنا ایوب علیہم السلام کے حق میں اَوَابٌ استعمال کیا گیا ہے۔^(۱۷۰) عربی ہونے کی صورت میں اس کا مصدر اَوَّبٌ ہو گا جس کے معنی بار بار رجوع کرنے کے ہیں۔ اکثر مفسرین اسے معرب اور دخیل نہیں تسلیم کرتے۔ راغب لکھتے ہیں: ”الْاَوْبُ ضَرْبٌ مِنَ الرَّجُوعِ، وَذَلِكَ اَنَّ الْاَوَابَ لَا يُقَالُ اِلَّا فِي الْحَيَوَانَ الَّذِي لَهُ اِرَادَةٌ، وَالرُّجُوعُ يُقَالُ فِيهِ وَفِي غَيْرِهِ.“^(۱۷۱) (الْاَوْبُ کے معنی رجوع ہونے کے ہیں لیکن رجوع کا لفظ عام ہے جو حیوان اور غیر حیوان دونوں کے لوٹنے پر بولا جاتا ہے مگر اَوَابٌ کا لفظ خاص کر حیوان کے اراداً لوٹنے پر بولا جاتا ہے۔) ابن جریر لکھتے ہیں: ”الْاَوَابُ: التَّوَابُ الَّذِي يَتُوبُ اِلَى طَاعَةِ اللهِ وَيَرْجِعُ اِلَيْهَا، وَذَلِكَ الْاَوَابُ، وَالْاَوَابُ: الْمَطْبِعُ.“^(۱۷۲) (الْاَوَابُ وہ ہے جو بہ کثرت اللہ تعالیٰ اور اس کی اطاعت کی طرف رجوع کرتا ہے، یہ مطبوع اور فرمان بردار کے لیے بھی مستعمل ہے۔) حدیث میں ہے کہ:

۱۶۸- ابن ابی حاتم، تفسیر ابن ابی حاتم، ج ۱۰، ص ۳۲۳

۱۶۹- تونسجی، المعرب والدخیل، ص ۱۹۳

۱۷۰- سورۃ ص: ۱۷، ۳۰، ۴۳

۱۷۱- راغب اصفہانی، المفردات، ص ۳۰

۱۷۲- ابن جریر، تفسیر ابن جریر، ج ۱۰، ص ۵۶۲؛ روایت، ص ۲۹۸۸۰

”لَا يُحَافِظُ عَلَى صَلَاةِ الضُّحَى إِلَّا أَوَّابٌ“ قَالَ: وَهِيَ صَلَاةُ الْأَوَّابِينَ“^(۱۴۳) (چاشت کی نماز کی محافظت اَوَّاب ہی کرے گا، اور یہی اَوَّابین کی نماز ہے۔) یہ بھی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ”صَلَاةُ الْأَوَّابِينَ حِينَ تَرْمِضُ الْفَصَالِ، وَفِي رِوَايَةٍ: صَلَاةُ الْأَوَّابِينَ إِذَا رَمَضَتِ الْفَصَالِ.“^(۱۴۴) (اَوَّابین کی نماز اس وقت ہے جب اونٹوں کے بچوں کے پاؤں ریت میں گرم ہونے لگتے ہیں۔) ہروی (وفات: ۴۰۱ھ) اور ابن اثیر (وفات: ۶۰۶ھ) لکھتے ہیں: ”وَهِيَ أَنْ تَحْمَى الرَّمَضَاءُ، وَهِيَ الرَّمْلُ، فَتَبْرُكُ الْفَصَالِ مِنْ شِدَّةِ حَرِّهَا، وَإِحْرَاقِهَا أَخْفَافَهَا.“^(۱۴۵) (یہ نماز اس وقت پڑھی جاتی ہے جب ریت گرم ہو جاتی ہے اور اس تپتی ریت میں اونٹ کے بچے شدت گرمی اور پاؤں کے گرم ہونے کی وجہ سے بیٹھ جاتے ہیں۔)

امام نووی لکھتے ہیں:

والرمضاء: الرمل الذي اشتدت حرارته بالشمس، أي: حين تحترق أخفاف الفصال، وهي الصغار من أولاد الإبل، جمع فصيل، من شدة حر الرمل، والأوَّابُ المطيع، وقيل: الراجع إلى الطاعة، وفيه فضيلة الصلاة هذا الوقت، قال أصحابنا: هو أفضل وقت صلاة الضحى، وإن كانت تجوز من طلوع الشمس إلى الزوال.^(۱۴۶)

رَمَضَاءُ شَدِيدٌ غَرْمٌ رَيْتٌ كَوَكَبَا جَاتَا هُوَ اَوْ فَصَالٌ، فَصِيلٌ كِي جَمْعُ هُوَ۔ اَوْنْتُ كِي جَمْعُ هُوَ نُوْنُ كِي كَوَكَبَا جَاتَا هُوَ۔ اَوَّابُ كِي مَعْنَى مَطِيْعٌ وَفَرْمَانُ بَرْدَارُ كِي هُوْنَ، يِهْ چَاشْتُ كِي نَمَازُ كَادُو سَرَانَامُ هُوَ، مَگَرَاتِي دِيرْتَكُ اس مِیْنِ تَاخِرُ كَرِنَا مَسْتَجِبُ هُوَ جَسْ وَتِ اَوْنْتُ كِي بَچَ شَدْتُ غَرْمِي كِي سَبَبُ چَرْنِ سِے بِيْٹھ جَاتِے هُوْنَ۔

۱۴۳- نیساپوری، المستدرک، ج ۱، ص ۳۱۴

۱۴۴- صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب صلاة الأوابین حين ترمض لفصال، حدیث:

۱۴۳، ۱۴۴

۱۴۵- ہروی، الغریبین، ج ۳، ص ۷۷۸، ابن اثیر جوزی، النہایة فی غریب الحدیث و الأثر، مادہ: ر م ض

۱۴۶- ابوز کریبکی بن شرف نووی، شرح صحیح مسلم، دمشق، مکتبۃ الغزالی، بدون تاریخ، ج ۶، ص ۳۰

شیخ عبدالقادر جیلانی لکھتے ہیں: ”فصلاة الضحیٰ ہی صلاة الاوابین.“ (پس صلاة اوابین چاشت کی نماز کا دوسرا نام ہے۔) اور اس کا افضل ترین وقت زوال سے تھوڑا آگے ہے اور یہی وہ وقت ہے جس میں اونٹوں کے بچے گرم ریت میں شدت گرمی کے باعث چرنا چھوڑ دیتے ہیں۔

اَوَاةٌ

ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے مجاہد اور عکرمہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ حبشی زبان کا لفظ ہے اور مُؤَقِّنٌ (یقین رکھنے والا / مؤمن) کے معنوں میں مستعمل ہے۔ (۱۷۸) سیدنا عمرو بن شریک (۱۷۹) سے اس کا معنی ”رحیم“ منقول ہے۔ (۱۸۰) قرآن مجید میں دو جگہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کہا گیا ہے کہ: ﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ﴾ (۱۸۱) ﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُنِيبٌ﴾ (۱۸۲)

اَوَاةٌ کے معنی كَثِيرُ التَّوَّاهِ، یعنی درد مند، غم خوار اور رقیق القلب کے ہیں اور حَلِيمٌ کے معنی بُرد بار کے ہیں۔ ان الفاظ سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی تعریف اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے باپ کے معاملے میں درد مندی اور بردباری بہت پسند آئی۔ آزر نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ نہایت سنگ دلانہ برتاؤ کیا تھا لیکن سعادت مند بیٹے نے حلم و بردباری سے نہ صرف باپ کی جھڑکی اور دھمکی برداشت کی، بلکہ غایت درد مندی کے ساتھ اُس کے لیے دعا و استغفار کا وعدہ بھی کر لیا۔

۱۷۷- عبدالقادر جیلانی، الغنیة لطالبي طريق الحق، ت: محمد خالد عمر، بیروت، دار إحياء التراث العربي، ۱۳۱۶ھ-

۱۹۹۶ء، ج ۲، ص ۹۵

۱۷۸- ابن ابی حاتم، تفسیر ابن ابی حاتم، ج ۶، ص ۱۸۹۶؛ ابن جریر، تفسیر ابن جریر، ج ۶، ص ۳۹۶

۱۷۹- آپ صحابی ہیں، ابن عبدالبر لکھتے ہیں کہ مجھے ان کے نسب نامے سے کوئی واقفیت نہیں، البتہ یہ بات طے ہے کہ آپ عمرو بن شریک جیل ہمدانی صاحب سیدنا ابن مسعود نہیں ہیں۔ (ابن عبدالبر، الاستیعاب فی معرفة الأصحاب، بیروت،

دار الجلیل، ج ۳، ص ۱۱۸۳)

۱۸۰- ابن جریر، مصدر سابق، ج ۶، ص ۳۹۶

۱۸۱- التوبة: ۱۱۳

۱۸۲- ہود: ۷۵

الأولى

پہلی، اگلی، عربی ہونے کی صورت میں اَوَّلٌ کا مؤنث۔ زرکشی، سیوطی اور تونجی لکھتے ہیں: ”والقبط یسمون الأخرۃ الأولى، والأولى: الأخرۃ“ (۱۸۳) (قبطی میں الأخرۃ کو الأولى کے معنی میں اور الأولى کو الأخرۃ کے معنی میں لیتے ہیں۔) ﴿مَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي الْمَلَةِ الْأَخْرَةَ﴾ (۱۸۴) (ہم نے تو یہ بات پچھلے مذہب میں نہیں سنی۔)

برہان

ڈاکٹر تونجی لکھتے ہیں: ”الکلمۃ حبشیۃ، مشتقۃ عندہم من ”برہ“: اَنْصَحَ وَأَنَارَ، وَأَصَافَ پلعرُبٌ علیہا نونا واشتقاومنها.“ (۱۸۵) (بنیادی طور پر یہ حبشی زبان کا لفظ ہے۔ برہ سے مشتق ہے، جس کے معنی واضح اور ظاہر ہونے کے ہیں۔ عربوں نے اس میں نون کا اضافہ کیا اور اسے مصدر بنا کر اس سے اشتقاق کیا۔)

راغب نے اسے ”برہ“ کے ذیل میں لکھ کر فرمایا ہے:

الْبُرْهَانُ کے معنی دلیل اور حجت کے ہیں اور یہ رُجْحَانٌ اور بُرْهَانٌ کی طرح فُعْلَانٌ کے وزن پر ہے۔ بعض کے نزدیک یہ بَرَّہٌ یَبْرَهُہُ کا مصدر ہے جس کے معنی سفید اور چمکنے کے ہیں۔ صفت أَبْرَهُہُ، أَبْرَهُہُ: گورے پن کے ساتھ گدازی بدن، أَلْبَرَهُہُ: سفید نوجوان حسینہ، جو حسن و نزاکت کی وجہ سے چمکتی ہو، رنگ کی صفائی کے باعث جس کی جلد چمک رہی ہو، تنعم و آسودگی کی وجہ سے جو تروتازہ ہو۔ أَلْبَرَهُہُ: وقت کا کچھ حصہ اور بُرْهَانٌ دلیل قاطع کو کہتے ہیں جو تمام دلائل سے زوردار ہو اور ہر حال میں ہمیشہ سچی ہو۔ (قرآن مجید میں ہے: ﴿قُلْ هَاؤُنَا بُرْهَانُكُمْ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ (۱۸۶) (کہو اپنی دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو۔) (۱۸۷)

۱۸۳- زرکشی، البرہان، ج ۱، ص ۲۸۸، سیوطی، الإنقان، ج ۱، ص ۱۸۰، تونجی، المعرب والدخیل، ص ۱۹۱

۱۸۴- ص: ۷

۱۸۵- تونجی، مرجع سابق، ص ۱۹۳

۱۸۶- البقرۃ: ۱۱۱

۱۸۷- راغب اصفہانی، المفردات، ص ۲۵

بَطَائِنُهَا

”بَطَائِنُهَا: ظواہرہا، بالقبطیۃ۔“^(۱۸۸) (قبلی زبان میں بَطَائِنُهَا کے معنی ظواہرہا (اس کا ظاہر) کے ہیں۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: ”قبلی زبان میں اس کے معنی ظواہرہا کے ہیں اور اگر اسے البطن کا مقابل قرار دیا جائے تو پھر یہ عربی ہے۔“^(۱۸۹) قرآن مجید میں ہے: ﴿مُتَّكِنِينَ عَلَى فُرُشٍ بَطَائِنُهَا مِنْ إِسْتَبْرَقٍ﴾^(۱۹۰) (وہ ٹیک لگائے ایسے بچھونوں پر بیٹھے ہوں گے جن کے استر استبرق کے ہوں گے۔)

بَعِيرٌ

ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: ”البعير: الدابة الذي يحمل الأحمال أو يجر العرب، قيل: هي عبرية وقيل: آرامية.“^(۱۹۱) (البعير: اُس جانور کے لیے بولا جاتا ہے جس پر بوجھ لاداجائے، بار برداری کا جانور، بتایا گیا ہے کہ یہ عبرانی یا آرامی زبان کا لفظ ہے۔) ابن جریر نے مجاہد کے حوالے سے ﴿وَنَزَّادُ كَيْلَ بَعِيرٍ﴾^(۱۹۲) کے تحت لکھا ہے: ”جمل حمار، قال هي لغة، وقال القاسم: يعني مجاهد: أن الحمارة يقال له في بعض اللغات بعير.“^(۱۹۳) (گدھے کا بار، یہ بھی ایک لغت ہے۔ قاسم نے فرمایا ہے کہ مجاہد کا مطلب یہ ہے کہ بعض لغات میں گدھے کے لیے بَعِيرٌ مستعمل ہے۔) ابن عطیہ بھی مجاہد کے حوالے سے لکھتے ہیں: ”أراد كَيْلَ حَمَارٍ، قال: وبعض العرب يقول للحمارة بعير، وهذا شاذ.“^(۱۹۴) (مراد گدھے کا بار ہے۔ بعض عرب گدھے کو بَعِيرٌ کہتے ہیں، لیکن یہ (قول) شاذ ہے۔)

۱۸۸- زرکشی، البرهان فی علوم القرآن، ج ۱، ص ۲۸۹

۱۸۹- تونجی، مرجع سابق، ص ۱۹۳

۱۹۰- الرحمن: ۵۴

۱۹۱- تونجی، مرجع سابق، ص ۱۹۳

۱۹۲- یوسف: ۶۵

۱۹۳- ابن جریر، تفسیر ابن جریر، ج ۷، ص ۲۳۷

۱۹۴- ابن عطیہ، المحرر الوجیز فی تفسیر الكتاب العزیز، ت: عبدالسلام عبدالشافی، بیروت، دار الکتب العلمیة،

مر تضحیٰ سیدی لکھتے ہیں:

سیدنا داؤد علیہ السلام کے زبور میں ہر بار برداری کرنے جانور کے لیے بعیر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور عبرانی زبان میں بھی ایسا ہی ہے۔ ان دونوں لغتوں کو ابن خالویہ نے ذکر کیا ہے۔ ابن بری کہتے ہیں: بعیر کے بارے میں ابن خالویہ اور متنبی کے مابین سیف الدولہ بن حمدان کی مجلس میں ایک سوال و جواب کا تبادلہ ہوا ہے، جس میں سائل ابن خالویہ تھے۔ ابن خالویہ نے کہا کہ گدھے کے لیے بَعِيرٌ کا استعمال بھی کیا جاتا ہے، جو ایک نادر لغت ہے، میں نے اسے متنبی کے سامنے بیان کیا۔ متنبی جو مغرور و متکبر اور بد اخلاق تھا، کھسیانا سا ہو گیا تو میں نے کہا کہ ﴿وَلَمَنْ جَاءَهُ يَدٌ فَجَمِلُ بَعِيرٍ﴾^(۱۹۵) میں بَعِيرٌ سے مراد گدھا ہے، اس لیے کہ سیدنا یعقوب علیہ السلام اور برادران یوسف کی رہائش کنعان میں تھی جہاں آمدورفت اور بار برداری کے کام گدھوں سے لیے جاتے تھے اور جہاں اونٹ نہیں تھے۔ یہ بات مقاتل بن سلیمان نے اپنی تفسیر میں لکھی ہے۔^(۱۹۶)

بِع

بِع: عبادت خانے، بَيْعَةٌ کی جمع ہے، جس کے معنی یہود و نصاریٰ کے عبادت خانہ اور گرجا کے ہیں۔
ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: ”الْبَيْعَةُ: الْكَنِيسَةُ، وَالْكَلِمَةُ آرَامِيَّةٌ أَصْلُهَا، وَمَعْنَاهَا الْبَيْضَةُ، وَالْأَرَامِيُّونَ يَلْفُظُونَ الضَّادَ عَيْنًا، وَهِيَ اسْمٌ لِمَعْبَدِ النَّصَارَى وَالْيَهُودِ.“^(۱۹۷) (کنیسہ کو بَيْعَةٌ کہتے ہیں۔ اصل میں یہ آرامی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی بَيْضَةٌ (انڈے) کے ہیں۔ آرامی لوگ ضاد کی جگہ عین پڑھتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کے عبادت خانے کو کہا جاتا ہے۔) جو الیقنی لکھتے ہیں: ”وَالْبَيْعَةُ وَالْكَنِيسَةُ جَعَلَ هُمَا بَعْضُ الْعُلَمَاءِ فَارَسِيِّينَ مَعْرَبِينَ.“^(۱۹۸) (بَيْعَةٌ اور كَنِيسَةُ کو بعض علما نے فارسی سے معرب جانا ہے۔)

۱۹۵- یوسف: ۷۲

۱۹۶- زبیدی، تاج العروس، مادہ: بعیر

۱۹۷- تونجی، مرجع سابق، ص ۱۹۳

۱۹۸- جو الیقنی، المعرب، ص ۲۰۷

ڈاکٹر عبدالرحیم نے کنیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اسے فارسی میں کُنِشْت کہا جاتا ہے، جو فارسی میں آرمی زبان سے در آیا ہے، جو اصل میں کنوشتا ہے، جب کہ عربی زبان میں کنیسة۔ کلدانی زبان سے آیا جو اصل میں کَنِیْشَةَ ہے۔ (۱۹۹)

تَبِيرٌ

ہلاک کرنا، ویران کرنا، بروزنِ تَفْعِيلٌ مصدر ہے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿وَلِيَسْتَرْوُوا مَا عَلَوُا تَبِيرًا﴾ (۲۰۰) (تاکہ جس چیز پر اُن کا زور چلے اُسے تہس نہس کر ڈالیں۔) ابن ابی حاتم لکھتے ہیں: ”تَبْرَانَا: دَمْرَانَا، بالنبطية“ (۲۰۱) (تَبْرَانَا کے معنی دَمْرَانَا کے ہیں اور یہ نبطی زبان کا لفظ ہے۔) ڈاکٹر محمد توحی لکھتے ہیں: ”والکلمة نبطية أصلها آرامي، ومن الطريف أن تَبْرَ بالفارسية بمعنى الفأس الذي تكسره الأشجار.“ (۲۰۲) (تَبِيرٌ نبطی کلمہ ہے، جو آرمی الاصل ہے۔ یہ عجیب لطیفہ ہے کہ فارسی زبان میں تَبْرٌ، درخت کاٹنے والے کلہاڑی کو کہا جاتا ہے۔)

تَحْتٌ

شیخ محمود بن حمزہ کرمانی نے ﴿فَنَادَاهَا مِنْ تَحْتِهَا﴾ (۲۰۳) کے تحت لکھا ہے: ”الغريب وَ رَج: مِنْ تَحْتِهَا، أي: من بطنها- بالنبطية- وهو بعيد.“ (۲۰۳) (مِنْ تَحْتِهَا کا ایک نہایت ضعیف معنی مورج سدوسی سيمينُ بَطْنِهَا (اُس کے پیٹ میں سے) کے نقل ہیں، جو نبطی زبان کا لفظ ہے، لیکن یہ معنی بعید ہے۔)

۱۹۹- جو الیق، نفس مصدر، ص ۲۰۸

۲۰۰- بنی اسرائیل: ۷

۲۰۱- ابن ابی حاتم، مرجع سابق، ج ۷، ص ۲۳۱۸

۲۰۲- ڈاکٹر توحی، مرجع سابق، ص ۱۹۴

۲۰۳- مریم: ۲۴

۲۰۴- رازی، عجائب القرآن، ج ۱، ص ۶۹۲

تَنُورٌ کے بارے میں علما کے دو قول ہیں:

- ۱- یہ فارسی سے عربی میں داخل ہوا ہے۔ ابن درید، جو الیقنی اور ابن جوزی کی یہی رائے ہے۔ (۲۰۵)
 - ۲- ابن قتیبہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے لکھا ہے: ”التَّنُورُ بکل لسان، عربی و عجمی“۔ (۲۰۶) (عربی اور عجمی ساری زبانوں میں تنور مستعمل ہے۔)
- ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: ”اسے عبرانی میں تنور پڑھا جاتا ہے، جب کہ آرامی اور سریانی زبانوں میں تنور ہے۔ ابستاقیہ اور پہلوی میں Tanura ہے۔“ (۲۰۷) ڈاکٹر عبدالرحیم یہ بھی لکھتے ہیں: ”وفي الأردنية تَنْدُور بقلبٍ إحدَى التُّونين دالاً، وهو محرفٌ من الكلمة العربية.“ (۲۰۸) (اردو میں تندور عربی کلمہ میں تحریف کر کے بنایا گیا ہے۔ (عربی کے تنور: ت، ن، و، ر) میں ایک نون کو دال سے بدل دیا گیا ہے۔)
- قرآن مجید میں ہے: ﴿وَفَارَ التَّنُورُ﴾ (۲۰۹) (اور زمین میں سے پانی ابلنا شروع ہوا۔) فَارَ، يَفُورُ کے معنی جوش مارنے والے کے ہیں۔ یہ لفظ پکتی ہوئی ہانڈی کے جوش مارنے اور ابلنے کے لیے بھی آتا ہے اور بھڑکتے ہوئے تنور کے جوش مارنے کے لیے بھی۔ یہاں فَارَ التَّنُورُ کا محاورہ، بہ طریق استعارہ اس سائیکلوپی طوفانی کی تعبیر کے لیے استعمال ہوا ہے جو قوم نوح پر آیا جس سے سخت بارش بھی ہوئی اور آس پاس کے سمندروں کا پانی بھی اُبل پڑا۔

۲۰۵- ابو بکر محمد بن الحسن بن درید، جھرة اللغة، باب القاء و الراء مع ما يليسهما الصحيح، مادة: ت ر و؛ جو الیقنی،

المعرب، ص ۲۱۲؛ ابن جوزی، فنون الألفان، ص ۱۱۶

۲۰۶- ابو محمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ، أدب الکاتب، ص ۳۸۲؛ جو الیقنی، مصدر سابق، ص ۲۱۳

۲۰۷- عبدالرحیم، مرجع سابق، ص ۲۱۴

۲۰۸- عبدالرحیم، مصدر سابق، ص ۲۱۴

۲۰۹- ہود: ۴۰؛ المؤمنون: ۲۷

تَوْرَاة

اس آسمانی کتاب کا نام ہے جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ یہ معرب ہے اور اس کی تفصیل اس کتاب میں ”انجیل“ کے تحت کی گئی ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمائیے:

التِّين

ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: ”یہ آرمی النسل کلمہ ہے۔“^(۲۱۰) قرآن مجید میں ہے: ﴿وَاللِّينِ وَالزَّيْتُونِ * وَطُورِ سِينِينَ * وَهَذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ *﴾^(۲۱۱) (شاہد ہیں جبل تین اور کوہ زیتون اور طور سینین اور یہ پر امن سر زمین۔)

جَالُوت

جَالُوت کا نام قرآن مجید میں دو بار آیا ہے۔^(۲۱۲) جو الیقنی لکھتے ہیں: جالوت: ”أعجمي، وقد جاء في القرآن.“^(۲۱۳) (جالوت عجمی ہے اور قرآن مجید میں آیا ہے۔) راغب اصفہانی لکھتے ہیں: ”ذَلِكَ أَعْجَمِي، لِأَصْلِ لِه فِي الْعَرَبِيَّةِ.“^(۲۱۴) (یہ عجمی ہے۔ عربی میں اس کا کوئی اصل نہیں۔) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں کہ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے۔^(۲۱۵)

۲۱۰- تونجی، المعرب والدخيل، ص ۱۹۴

۲۱۱- التين: ۱-۳

۲۱۲- البقرة: ۲۳۹-۲۵۰

۲۱۳- جو الیقنی، المعرب، ص ۲۳۵

۲۱۴- راغب اصفہانی، المفردات، ص ۹۵

۲۱۵- عبدالرحیم، هامش المعرب، ص ۲۳۵

جِبْت

ابن ابی حاتم نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے لکھا ہے: ”الجِبْتُ: اسم الشیطان بالحِشِیة“^(۲۱۶) (حبشی زبان میں شیطان کا نام جِبْتُ ہے۔) ابن جریر اور ابن جوزی نے ابو العالیہ، ابن زید اور سعید بن جبیر کے حوالے سے لکھا ہے: ”الجِبْتُ: السَّاحِرُ بِلِسَانِ الْحِشِیةِ.“^(۲۱۷) (حبشی زبان میں جِبْتُ، ساحر کو کہتے ہیں۔) ڈاکٹر محمد توحی لکھتے ہیں: ”الجِبْتُ: اسم الشیطان، كما تُطْلَقُ علی الصنم، و الکاهنِ و السَّاحِرِ قیل: هی حبشِیة.“^(۲۱۸) (جِبْتُ، شیطان کا نام ہے اور بت، کاہن اور ساحر کے لیے بھی یہ لفظ مستعمل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حبشی زبان کا لفظ ہے۔)

جُنَاح

گناہ، جُنُوح سے ماخوذ ہے جس کے معنی ایک طرف مائل ہونے کے ہیں، اس لیے وہ گناہ جو انسان کو حق سے مائل کر دے اور دوسری طرف جھکا دے جُنَاح سے موسوم ہو اور پھر ہر گناہ کے لیے اس کا استعمال ہونے لگا۔ ڈاکٹر محمد توحی لکھتے ہیں: ”بمعنی الإثم والذنب، من ”گناہ“ الفارسیة، وقیل: العکس.“^(۲۱۹) (جُنَاح، گناہ کے معنی میں مستعمل ہے۔ فارسی کے ”گناہ“ سے ماخوذ ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ فارسی والوں نے جُنَاح سے گناہ بنا لیا ہے۔)

جند

لشکر، فوج، جند سے ماخوذ ہے۔ جند اُس سخت زمین کو کہتے ہیں جس میں پتھروں کا ڈھیر ہو، پھر ہر گروہ اور جماعت کو جند کہنے لگے۔ ابن فارس لکھتے ہیں: ”اس کے بنیادی معنی اکٹھا ہونے اور مدد کرنے کے

۲۱۶- ابن ابی حاتم، تفسیر ابن ابی حاتم، ج ۳، ص ۹۷

۲۱۷- ابن جریر، تفسیر ابن جریر، ج ۴، ص ۱۳۵؛ ابن جوزی، زاد المسیر فی علم التفسیر، ت: عبدالرزاق المہدی، بیروت،

دارالکتاب العربی، ۱۴۲۲ھ-۲۰۰۱ء، ج ۱، ص ۲۱۹

۲۱۸- ڈاکٹر توحی، مرجع سابق، ص ۱۹۴

۲۱۹- ڈاکٹر توحی، مرجع سابق، ص ۱۹۵

ہیں۔ مضبوطی اور سختی کی وجہ سے لشکر کو جُنْدُ کہتے ہیں، اس کی جمع جُنُودُ آتی ہے اور جمع ہو جانے کے اعتبار سے ہر جماعت اور انصار کو جُنْدُ کہتے ہیں۔“ (۲۲۰)

جَهَنَّمَ

جوابی لکھتے ہیں: ”قیل: إنه عربي، ولم يُجْرَلْ للتأنيث والتعريف، وحكي عن رؤبة أنه قال: رَكِيَّةٌ جِهَنَّمًا: بعيدة القعر.“ (۲۲۱) (کہا گیا ہے کہ یہ عربی کلمہ ہے اور مؤنث و معرفہ ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ رؤبہ سے مروی ہے کہ رَكِيَّةٌ جِهَنَّمًا کے معنی ہیں: گہری تیر والا کنواں۔) انھوں نے یہ بھی لکھا ہے: ”جَهَنَّمَ اسمٌ للنار التي يعذبُ بها الله في الآخرة، وهي أعجميةٌ، لا تجري للتعريف والعجمة.“ (۲۲۲) (جہنم اُس آگ کا نام ہے جس میں اللہ تعالیٰ (مجرموں کو) آخرت میں عذاب دے گا۔ یہ عجمی کلمہ ہے۔ معرفہ اور عجمہ کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔) ابن جوزی لکھتے ہیں: ”وأكثر النحويين والعلماء على أنّ جَهَنَّمَ أعجمية.“ (۲۲۳) (اکثر نحویوں اور علما کے نزدیک جہنم عجمی کلمہ ہے۔) راغب اور جوہری کہتے ہیں: ”يقالُ هو فارسي معربٌ، وهو جِهَنَامٌ.“ (۲۲۴) (کہا جاتا ہے کہ یہ فارسی سے عربی میں داخل ہوا ہے، جو اصل میں جہنام ہے۔) ابن منظور افریقی لکھتے ہیں: ”وقيل: هو تعريب كِهِنَامٍ بالعبرانية.“ (۲۲۵) (کہا گیا ہے کہ یہ عبرانی زبان کے كِهِنَامٍ کا معرب ہے۔) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: ”والصحيح أنه عبري، وأصله:

۲۲۰- ابوالحسن احمد بن فارس بن زکریا، معجم مقاییس اللغة، باب الجیم و النون وما یتلثها، ماده: ج ن د

۲۲۱- جوابی، المعرب، ص ۲۴۹

۲۲۲- جوابی، نفس مصدر، ص ۲۴۹

۲۲۳- ابن جوزی، فنون الأفتان، ص ۱۱۶

۲۲۴- راغب اصفہانی، المفردات، ص ۱۰۲: جوہری، الصحاح تاج اللغة و صحاح العربیة، فصل الجیم، ماده: جہنم،

ج ۵، ص ۱۸۹۲

۲۲۵- ابن منظور، لسان العرب، حرف المیم، فصل الجیم

كَيْهَنُومٌ وَكَيْهَنَامٌ. “(صحیح بات یہ ہے کہ یہ عبرانی کلمہ ہے جو اصل میں كَيْهَنُومٌ یا كَيْهَنَامٌ ہے۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: ”الكلمة عبرية، أصلها كَيْهَنُومٌ، وهو اسم وإدِ قِربِ القِديسِ، جعل مزبلةً و محرقَةً.“ (۲۲۷) (یہ عبرانی کلمہ ہے، جس کی اصل كَيْهَنُومٌ ہے۔ قدس کے قریب ایک وادی کا نام ہے جہاں کوڑا کرکٹ جمع کر کے جلایا جاتا تھا۔)

حَرْمٌ

راغب لکھتے ہیں: ”الحرام: الممنوع منه إمّا بتسخير إلهي، وإمّا بمنع قهري، وإمّا بمنع من جهة العقل أو من جهة الشرع أو من جهة من يرتسم أمره.“ (۲۲۸) (جس چیز سے منع کر دیا جائے وہ حرام ہے، خواہ بہ تسخیر الہی ممنوع ہو یا بہ منع قہری یا عقل کی رو سے یا شرع کی طرف سے یا اس شخص کی وجہ سے جس کا حکم مانا جاتا ہے۔) ﴿وَحَرَامٌ عَلَى قَرْبِيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ﴾ (۲۲۹) (اور ہم جس بستی کو ہلاک کر دیتے ہیں نا ممکن ہے کہ وہ لوگ پھر لوٹ کر آئیں۔) ابن ابی حاتم نے عکرمہ کی سند سے لکھا ہے: ”وَحَرْمٌ: وَجَبَ، بِالْحَبَشِيَّةِ.“ (۲۳۰) (حبشی زبان میں حَرْمٌ کے معنی لازم ہونے کے ہیں۔) ابن قتیبہ لکھتے ہیں: ”أَيُّ: حَرَامٌ عَلَيْهِمْ أَنْ يَرْجِعُوا، وَقِيلَ: حَرَامٌ: وَاجِبٌ.“ (۲۳۱) (اُن کا واپس لوٹنا ممکن نہیں، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہاں حرام کے معنی واجب (لازم) کے ہیں۔)

۲۲۶- ڈاکٹر عبدالرحیم، ہامش المغرب، ص ۲۵۰

۲۲۷- ڈاکٹر تونجی، المغرب والدخيل، ص ۱۹۵

۲۲۸- راغب اصفہانی، مصدر سابق، ص ۱۱۴

۲۲۹- الأنبياء: ۹۵

۲۳۰- ابن ابی حاتم، تفسیر ابن ابی حاتم، ج ۸، ص ۲۴۶

۲۳۱- ابو محمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ، تفسیر غریب القرآن، ت: سید احمد صفحہ، بیروت، دارالکتب العلمیة، ۱۹۷۸،

ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: ”علیٰ قراءۃ ”وَحَرْمٌ“ حَرْمٌ: کلمۃً آراميةً بمعنی طرد الكنيسة شخصاً من شركة المؤمنین.“ (۲۳۲) (وَحَرْمٌ کی قراءت کے مطابق، حَرْمٌ، آرامية زبان کا کلمہ ہے، جس کے معنی ہیں کنیسہ کا کسی شخص کو مؤمنوں کے ساتھ شرکت کرنے کی وجہ سے جلاوطن کرنا۔)

حَصَبٌ

الْحَصْبَةُ: کنکری، پتھر، الْحَصَبُ: ایندھن، ہر وہ چیز جس سے آگ بھڑکائی جائے۔ لکڑی کو بھی اُس وقت حَصَبٌ کہہ سکتے ہیں جب اُس سے آگ کو بھڑکایا اور روشن کیا جائے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ (۲۳۳) (تم اور تمہارے وہ معبود جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو، جہنم کا ایندھن ہیں۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: ”حَصَبٌ: حَطْبٌ بالحِشِيَّة“ (۲۳۴) (حِشِيَّةً زبان میں حَصَبٌ کے معنی حَطْبٌ (ایندھن) کے ہیں۔)

حِطَّةٌ

سیوطی حِطَّةً کو معرب تسلیم کرتے ہیں۔ (۲۳۵) وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ: ”وينبغي أن يكون معرباً مصرحاً به، ففي تفسير الأصبهاني مانصه: إن هذه اللفظة من ألفاظ أهل الكتاب، لا يعرف معناها في العربية“ (۲۳۶) (یہ صریحی طور پر معرب ہے۔ تفسیر اصبہانی میں ہے کہ یہ اہل کتاب کی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی عربی زبان میں معلوم نہیں۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: ”عبريَّة، لفظها عندهم

۲۳۲- ڈاکٹر تونجی، مرجع سابق، ص ۱۹۵

۲۳۳- الأنبياء: ۹۶

۲۳۴- ڈاکٹر تونجی، مرجع سابق، ص ۱۹۵

۲۳۵- سیوطی، المہذب، ص ۵۴

۲۳۶- سیوطی، نفس مصدر، ص ۵۴

”حَطًّا.“^(۲۳۷) (عبری زبان کا کلمہ ہے، جو اُن کے ہاں ”حِطًّا“ پڑھا جاتا ہے۔) راغب لکھتے ہیں: ”كَلِمَةٌ أَمْرٌ بِهَا بَنِي إِسْرَائِيلَ، وَمَعْنَاهُ: حُطُّ عَنَّا ذُنُوبَنَا، وَقِيلَ مَعْنَاهُ: قَوْلُوا صَوَابًا.“^(۲۳۸) (بنی اسرائیل کو اس کلمہ کو پڑھنے کا حکم دیا گیا تھا، جس کا معنی یہ ہے کہ ہمارے گناہ ہم سے اُتار دے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں: درست اور ٹھیک بات کہا کرو۔)

حَوَارِيُّونَ

یہ کلمہ سورۃ آل عمران: ۵۲، سورۃ المائدہ: ۱۱۱، ۱۱۲ اور سورۃ الصف: ۱۴ میں وارد ہے۔

حواری کی جمع ہے، راغب نے لکھا ہے:

(حَوَارُتُ الشَّيْءِ: کسی چیز کو گھمانا، (پڑے کا) سفید کرنا اسی سے اَلْحَوَارِيُّونَ ہے جس کے معنی میدے کی روٹی کے ہیں۔ سیدنا عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کے انصار و اصحاب کو حَوَارِیِّیْنَ کہا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ تَقَارٌ یعنی دھوبی تھے جب کہ بعض نے کہا ہے کہ وہ عِنَادٌ یعنی شکاری تھے۔ بعض علما کا خیال ہے کہ ان کو حَوَارِیِّیْنَ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو علمی اور دینی فائدہ پہنچا کر گناہوں کی میل سے اپنے آپ کو پاک کرتے تھے، جس پاکیزگی کی طرف آیت کریمہ: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾^(۲۳۹) میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ اس بنا پر انھیں تمثیل اور تشبیہ کے طور پر قَصَاصُ کہہ دیا گیا ہے ورنہ اصل میں وہ دھوبی کا کام نہیں کرتے تھے۔ اس سے وہ شخص مراد لیا جاتا ہے جو معرفتِ حقائق کی بنا پر عوام میں متداول پیشوں میں سے کوئی پیشہ اختیار نہ کرے، اسی طرح ان کو صَبِيَّاءُ اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو حیرت سے نکال کر حق کی طرف لا کر گویا ان کا شکار کرتے تھے۔ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے سیدنا زبیر رَضِيَ اللہُ عَنْہُ کے بارے میں فرمایا: ”الزُّبَيْرُ ابْنُ عَمِيَّتِي وَحَوَارِيٍّ مِنْ أُمَّتِي.“^(۲۴۰)

۲۳۷- ڈاکٹر توحی، مرجع سابق، ص ۱۹۵

۲۳۸- راغب اصفہانی، مصدر سابق، ص ۱۲۲

۲۳۹- الأحزاب: ۳۳

۲۴۰- ابن ابی شیبہ، مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الفضائل، ما حفظت فی الزبیر بن العوام، حدیث: ۳۲۸۲۶

(زبیر میرا پھوپھی زاد بھائی اور حواری ہے) نیز فرمایا: ”إِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوَارِيًّا وَحَوَارِيَّ الزُّبَيْرِ بْنِ الْعُومِ.“^(۲۳۱)

(بے شک ہر نبی کا کوئی نہ کوئی حواری رہا ہے اور میرا حواری زبیر بن عوام ہے۔)^(۲۳۲)

اس روایت میں سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ کو حواری کہنا محض نصرت اور مدد کے لحاظ سے ہے، جیسا کہ سیدنا

عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا: ﴿مَنْ أَنْصَارِيَّ إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ﴾^(۲۳۳) (بھلا کون ہیں جو اللہ کی

طرف (بلانے میں) میرے مددگار ہوں۔ حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار ہیں۔) ابن ابی حاتم لکھتے ہیں:

”بالنبطية: هواري، وبالعربية: المحوّر“^(۲۳۴) (نبطی زبان میں ”ہواری“ عربی میں ”المحوّر“ (سفید کرنے

والا) ہوا۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: ”هم الغَسَّالُونَ بالسريانية من ”حورا“ أي: الأبيض، لأنَّ

أصحاب المسيح كانوا يغسلون الثياب ويبيّضونها، وهي كذلك بالنبطية من ”هواري.“^(۲۳۵)

(سریانی زبان میں ”حورا“ بمعنی سفید سے نکلا ہوا ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کے ساتھی دھوبی کا کام کرتے اور کپڑوں

کو سفید کرتے تھے، جب کہ نبطی زبان میں یہ ”ہواری“ ہے۔)

حُوبٌ

ابن فارس لکھتے ہیں: ”الحاء والواو والباء أصلٌ واحدٌ يتشعبُ إلى إثم أو حاجة

أو مسكنة.“^(۲۳۶) (ح، و، ب کے بنیادی معنی گناہ، حاجت یا مسکنت کے ہیں۔) راغب لکھتے ہیں: ”الحوبة أي

المسكنة والحاجة وحقيقتها هي الحاجة التي تحملُ صاحبها على ارتكابِ الاثم.“^(۲۳۷)

(الحوبة کے معنی مسکنت و حاجت کے ہیں، ایسی حاجت جو محتاج کو ارتکابِ جرم پر آمادہ کرے۔) قرآن مجید میں

۲۳۱- صحیح بخاری، کتاب الجهاد والسير، باب هل يبعث الطبيعة وحده، حدیث: ۲۸۴۷

۲۳۲- راغب اصفہانی، مصدر سابق، ص ۱۳۵

۲۳۳- الصف: ۱۴

۲۳۴- ابن ابی حاتم، تفسیر ابن ابی حاتم، ج ۲، ص ۶۵۹

۲۳۵- ڈاکٹر تونجی، مرجع سابق، ص ۱۹۵

۲۳۶- ابوالحسین زکریا، معجم مقاییس اللغة، باب الحاء والواد وما معها من الحروف الثلاثی

۲۳۷- راغب اصفہانی، مصدر سابق، ص ۱۳۴

یتیم کا مال کھانے کو حُوبًا كَبِيرًا^(۲۳۸) کہا گیا ہے۔ سیوطی نے مسائل نافع بن ارزق کے حوالے سے سیدنا ابن عباس عَلَیْہِ السَّلَام سے نقل کیا ہے: ”حُوبًا: إِثْمًا، بِلُغَةِ الْحَبَشَةِ.“^(۲۳۹) (حُوبٌ کے معنی حبش کی لغت میں گناہ کے ہیں۔) ڈاکٹر محمد تونسجی لکھتے ہیں: ”حوب کے معنی گناہ کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حبشی زبان کا کلمہ ہے اور یہ بھی کہ یہ عربی کلمہ ہے۔“^(۲۵۰)

دَاوُدَ عَلَیْہِ السَّلَام

جوہری لکھتے ہیں: داود عجمی نام ہے۔^(۲۵۱) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: ”یہ عبرانی میں داود اور داوید ہے، جب کہ سریانی میں دُوید اور داوید ہے۔ تعریب کے وقت ”د“ کو پیش دیا گیا۔ عبری میں اس کے معنی محبوب کے ہیں۔“^(۲۵۲)

دَرَسَتْ

﴿وَكَذَلِكَ نَصْرَفُ الْآيَاتِ وَلِيَقُولُوا دَرَسَتْ﴾^(۲۵۳) (اور اسی طرح ہم اپنی دلیلیں مختلف اسلوبوں سے پیش کرتے ہیں [تاکہ ان پر حجت قائم ہو] اور تاکہ وہ بول اُٹھیں کہ تم نے اچھی طرح پڑھ کر سنا دیا۔) سیوطی لکھتے ہیں: ”دَارَسَتْ معناه: قَارَأَتْ، بِلُغَةِ الْيَهُودِ.“^(۲۵۴) (دَارَسَتْ کے معنی یہود کی لغت میں قَارَأَتْ کے ہیں۔) ڈاکٹر محمد تونسجی لکھتے ہیں: ”دَرَسَتْ: مِنَ الدَّرَاسَةِ الْعِبْرِيَّةِ بِمَعْنَى: قَرَأَتْ، وَالْمِدْرَاشُ

۲۳۸- النساء: ۲

۲۳۹- سیوطی، الإقتان في علوم القرآن، ج ۱، ص ۱۸۱

۲۵۰- ڈاکٹر تونسجی، مرجع سابق، ص ۱۹۵

۲۵۱- جوہری، الصحاح، فصل الدال، مادہ: دود

۲۵۲- عبدالرحیم، هامش المعرب، ص ۳۰۹

۲۵۳- الأنعام: ۱۰۵

۲۵۴- سیوطی، مرجع سابق، ج ۱، ص ۱۸۱

عندهم: المدرسة التي تدرس فيها التوراة، وشينهم سينٌ عربيةٌ.“ (دَرَسَتْ عبرانی کے دِرَاسَة سے ہے جس کے معنی پڑھنے کے ہیں اُن کے نزدیک المِدرَاشُ وہی ہے جو ہمارے ہاں مدرسہ ہے۔ المِدرَاشُ میں تورات پڑھائی جاتی اور اُن کا ”ش“ عربی کا ”س“ ہے۔) اور مولانا اصلاحی صاحب کا نقطہ نظر ہے کہ: دَرَسَ کے اصلی معنی تو گھسنے اور مٹانے کے ہیں، دَرَسَ الرَّسْمَ کے معنی ہوں گے: مَحَاہُ، نشان کو مٹا دیا۔ آدمی جب کسی چیز کو کثرت سے بار بار پڑھتا ہے، بالخصوص جب اس پر انگلی رکھ کر ایک ایک حرف کو متعین کر کے پڑھتا ہے، جیسا کہ مذہبی صحیفوں کی تلاوت کے لیے رواج ہے، تو بالعموم وہ نسنے گھسنے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے لفظ دَرَسَ کسی کتاب کو اچھی طرح بار بار، کرات و مرات پڑھنے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ لغت میں اس بات کو یوں تعبیر کرتے ہیں: دَرَسَ الْكِتَابَ: أَقْبَلَ عَلَيْهِ يَحْفَظُهُ. (۲۵۱)

دِرْهَمٌ

چاندی کے ایک سکے کا نام ہے، اس کی جمع دَرَاهِمٌ ہے۔ یہ عربی لفظ نہیں۔ بعض نے اس کی اصل فارسی قرار دی ہے اور بعض نے یونانی۔ جوہری لکھتے ہیں: ”الدِّرْهَمُ فارسی معرب، وكسر الھاء لغة، وربما قالوا: دِرْهَامٌ... وجمع الدرهم: دراهم وجمع الدراهم: دراهيم.“ (۲۵۷) (دِرْهَمٌ فارسی سے معرب ہے، اسے دِرْهَمٌ بھی پڑھا جاتا ہے اور کبھی کبھی دِرْهَامٌ بھی کہتے ہیں۔ دِرْهَمٌ کی جمع دَرَاهِمٌ اور جمع الجمع دَرَاهِيمٌ ہے۔) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: ”وهو بالفارسية الحديثة ”درم“ وبالfehloية Dirm (درم) و Diraxm (دِرْخَمٌ) و Dirham (درهم) ويبدو أنه دخل في العربية من الفهلوية وعُرب من الصيغة الأخيرة“ (۲۵۸) (جدید فارسی میں اسے درم پڑھا جاتا ہے۔ پہلوی میں دِرْمٌ، دِرْخَمٌ اور

۲۵۵- ڈاکٹر تونجی، مرجع سابق، ص ۱۹۶

۲۵۶- امین احسن اصلاحی، تدریس قرآن، لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۲۰۰۵ء، ج ۳، ص ۱۳۳

۲۵۷- جوہری، مرجع سابق، فصل الدال، مادہ: درهم

۲۵۸- عبدالرحیم، هامش المعرب، ص ۳۰۷

دِرْہَمُ ہے اور بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عربی زبان میں پہلوی زبان سے در آیا ہے، بالخصوص آخری کلمے سے۔) قرآن مجید میں ہے: ﴿وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ﴾^(۲۵۹) (اور انھوں نے اُس کو ایک حقیر قیمت، چند درم کے عوض بیچ دیا۔)

دَرِي

سیوطی لکھتے ہیں: ”دَرِيٌّ معناه: المضيئ بالحبشية، حكاہ شيدلة و أبو القاسم.“^(۲۶۰) (دَرِيٌّ کے معنی روشن کے ہیں، یہ حبشی زبان کا لفظ ہے۔ شیدلہ اور ابو القاسم نے بھی ایسا کہا ہے۔) قرآن مجید میں ہے: ﴿الزَّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دَرِيٌّ﴾^(۲۶۱) (شیشہ ایک چمکتے تارے کی مانند ہو۔)

دِينَارٌ

ابن درید اور جوالیقی لکھتے ہیں: ”والدِّينَارُ فارسيّ معرب، وأصله دِنَارٌ، وهو وإن كان معرَّبًا فليس تعرف له العَرَبَ اسْمًا غير الدينار فقد صار كالعربي، ولذلك ذكره الله تعالى في كتابه لأنه خاطبَهُم بيا عرفوا“^(۲۶۲) (دینار فارسی سے معرب ہے، جس کی اصل دِنَار ہے، یہ اگرچہ معرب ہے، لیکن عرب اس کے لیے کوئی دوسرا نام نہیں جانتے اس لیے یہ عربی زبان کا لفظ ٹھہرا۔ اللہ تعالیٰ نے اس لیے اسی نام کو اپنی کتاب میں ذکر کیا کہ اس نے عربوں کو اُن کے مانوس کلام سے مخاطب کیا ہے۔) ڈاکٹر عبد الرحیم لکھتے ہیں: ”یہ اصل میں لاطینی ہے جس کی اصل Denarius ہے جس کے معنی ”دس آسات“ کے ہیں، جب کہ آس (As) پیتل کا ایک سکہ ہے۔ لاطینی سے یہ سریانی میں آیا اور وہاں سے پہلوی میں۔ پہلوی میں اسے Denar پڑھا جاتا ہے اور غالب گمان یہ ہے کہ یہ عربی میں پہلوی کے راستے آیا ہے۔“^(۲۶۳) قرآن مجید میں ہے: ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ إِنْ

۲۵۹- یوسف: ۱۲

۲۶۰- سیوطی، مرجع سابق، ج ۱، ص ۱۸۱

۲۶۱- النور: ۳۵

۲۶۲- ابوبکر درید، جمهرة اللغة، باب الدال و الدار، مادہ: در و؛ عبد الرحیم، هامش المعرب، ص ۲۹۰

۲۶۳- عبد الرحیم، نفس مرجع، ص ۲۹۰

تَأْمَنُ بِدِينِكَ لَا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا ﴿٢٦٣﴾ (اور ان میں سے وہ بھی ہیں کہ اگر تم اُن کی امانت میں ایک دینار بھی رکھو تو وہ اس وقت تک اُس کو لوٹانے والے نہیں ہیں جب تک تم اُس کے سر پر سوار نہ ہو جاؤ۔)

رَاعِنًا

ابو نعیم نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے لکھا ہے: ”لَا تَقُولُوا رَاعِنًا، وَذَلِكَ أَنَّهَا سَبَّةٌ بِلُغَةِ الْيَهُودِ.“ (۲۶۵) (یہود کی زبان میں رَاعِنًا ایک گالی کے معنوں میں مستعمل ہے۔) ڈاکٹر محمد توحی لکھتے ہیں: ”عبرانی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی سب و تنقیص کے ہیں۔“ (۲۶۶) قرآن مجید میں ہے: ﴿يَتَأْتِيَهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنًا وَقُولُوا أَنْظِرْنَا﴾ (۲۶۷) (ایمان والو! رَاعِنًا مت کہو اور اُنظِرْنَا کہو۔) رَاعِنًا کو ذرا نیچے کی طرف دبا کر ادا کیجیے تو بڑی آسانی سے رَاعِنًا بن جائے گا جس کے معنی ہمارے چرواہے کے ہیں۔ یہود کی اس شرارت کا ذکر قرآن مجید میں دوسری جگہ بھی ہے: ﴿مَنْ الَّذِينَ هَادُوا يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأَسْمَعُ غَيْرَ مُسْمِعٍ وَرَاعِنًا لِيًّا بِأَلْسِنِهِمْ وَطَعْنَا فِي آلِ الَّذِينَ﴾ (۲۶۸) (یہود میں وہ لوگ بھی ہیں جو کلام کو اس کے موقع و محل سے ہٹاتے ہیں اور اپنی زبانوں کو لچکا کر کہتے ہیں: سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأَسْمَعُ غَيْرَ مُسْمِعٍ وَرَاعِنًا دین پر طنز کرنے کے لیے۔) مگر اس کی سند شدید ضعیف ہے، اس لیے کہ: اس کا ایک راوی موسیٰ بن عبدالرحمن ثقفی صنعانی ہے، جس کے بارے میں حافظ ذہبی نے لکھا ہے: ثقہ نہیں (۲۶۹) هَالِكٌ ہے۔ (۲۷۰) ابن حبان لکھتے ہیں: شیخ اور دجال ہے۔ احادیث وضع

۲۶۳- آل عمران: ۷۵

۲۶۵- ابو نعیم اصفہانی، دلائل النبوة، ت: ڈاکٹر محمد رواں قلعہ جی، بیروت، دارالنفائس، ۱۴۱۲-۱۹۹۱ء، ص ۴۴؛ روایت: ۶،

سیوطی، الإتقان، ج ۱، ص ۱۸۱

۲۶۶- ڈاکٹر توحی، مرجع سابق، ص ۱۹۶

۲۶۷- البقرة: ۱۰۴

۲۶۸- النساء: ۴۶

۲۶۹- ذہبی، میزان الاعتدال، ج ۳، ص ۲۱۱

۲۷۰- ذہبی، المغنی فی الضعفاء، ت: نور الدین ثمر، بدون ناشر و تاریخ، ج ۲، ص ۶۸۳

کرتا ہے۔ اس نے کلبی اور مقاتل بن سلیمان کی کتابوں سے ایک تفسیر جمع کی اور پھر ابن جریج عن عطاء عن ابن عباس صکی سند سے اس کی روایت کرنے لگا۔^(۲۴۱) ابن عدی لکھتے ہیں: منکر الحدیث ہے۔^(۲۴۲)

رَبَّانِيُونَ

﴿ مَا كَانَ لِإِبْرَاهِيمَ أَنْ يُتَوَكَّلَ عَلَى اللَّهِ أَلَمْ يَكُنِ اللَّهُ يَوْمَ الْمَلَأِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ لَاحِبًا لِلَّذِينَ آمَنُوا قَوْلًا بِغَيْرِ إِثْمٍ إِذْ يَقُولُ لِغُفَّارٍ لَكُمُ اللَّهُ وَبِالَّذِينَ ظَلَمُوا عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾^(۲۴۳) (کسی بشر کی شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اُس کو کتاب، قوت فیصلہ اور منصب نبوت عطا فرمائے پھر وہ لوگوں کو دعوت دے کہ لوگو! اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ، بلکہ وہ تو لوگوں کو یہ دعوت دے گا کہ لوگو! اللہ والے بنو۔) ﴿يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ﴾^(۲۴۴) (اسی کے مطابق انبیاء جو اللہ کے فرمان بردار تھے، یہودیوں کو حکم دیتے رہے ہیں اور مشائخ و علما بھی کیوں کہ وہ کتاب اللہ کے نگہبان مقرر کیے گئے تھے۔) ﴿لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْإِلَافَةَ وَأَكْلِهِمُ السَّحْتِ﴾^(۲۴۵) (ان کے علما اور فقہاء ان کو گناہ کی بات کہنے اور ان کو حرام کھانے سے روکتے کیوں نہیں؟) ازہری نے ابن اعرابی کے حوالے سے لکھا ہے کہ: ”الرباني: العالم المَعْلَمُ الذي يَعْذُو الناسَ بصغار العلوم قبل كبارها.“^(۲۴۶) (ربانی وہ بڑا عالم ہے جو لوگوں کو ابتدا میں چھوٹے علوم سکھاتے ہیں اور تدریجاً انھیں بڑے علوم کی طرف لے جاتا ہے۔)

راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

۲۴۱- ابن حبان، المجروحین من المحدثین، سعودیہ، دار الصحیحین، ۱۴۲۰ھ - ۲۰۰۰ء، ج ۲، ص ۲۵۰

۲۴۲- ابو احمد عبد اللہ بن عدی جرجانی، الكامل فی الضعفاء، ت: جماد احمد عبد الموجود، بیروت، دار الکتب العلمیة،

۱۴۱۸ھ - ۱۹۹۷ء، ج ۸، ص ۶۶

۲۴۳- آل عمران: ۷۹

۲۴۴- المائدة: ۴۴

۲۴۵- المائدة: ۶۳

۲۴۶- ازہری، تہذیب اللغة، مادہ: رب

رَبَّانِيٌّ کے متعلق بعض کا قول ہے کہ وہ رَبَّانٌ کی طرف منسوب ہے اور لفظ فَعْلَانٌ فَعَلَ (بکسر العین) سے بنایا جاتا ہے جیسے عَطَشَانٌ اور سَكَرَانَ اور قلت کے ساتھ فَعَلَ (بفتح العین) سے بنتا ہے جیسے نَعْسَانٌ آیا ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ رَبٌّ کی طرف منسوب ہے جو مصدر ہے اور رَبَّانِيٌّ وہ ہے جو علم کی پرورش کرے جیسا کہ حکیم ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ منسوب تو اسی کی طرف ہے جو مصدر ہے اور اس کے معنی اُس شخص کے ہیں جو اپنے نفس کی علم کے ذریعے تربیت کرے اور حقیقت میں یہ دونوں معنی باہم متلازم ہیں، کیوں کہ جس نے بہ ذریعہ علم اپنے نفس کی پرورش کی اور جس نے علم کی پرورش کی اس نے اس کے ذریعہ اپنے نفس کی پرورش کی۔ بعض کا قول ہے کہ یہ رَبٌّ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے، پس جیسے اِلٰهِيٌّ ہے اسی طرح رَبَّانِيٌّ ہے اور نون کا اضافہ اس میں ایسا ہی ہے جیسا کہ اہل عرب لِحَيَاتِيٌّ اور حِسْمَاتِيٌّ کے بولتے وقت کرتے ہیں۔ سیدنا علیؑ کا ارشاد ہے: میں اسی امت کا رَبَّانِيٌّ ہوں۔ اس کی جمع رَبَّانِيُّونَ ہے اور بعض کا قول ہے کہ لفظ رَبَّانِيٌّ اصل میں سریانی ہے اور یہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کیوں کہ یہ اہل عرب کے کلام میں قلیل الوجود ہے۔^(۲۷۷)

ازہری لکھتے ہیں: ”روي عن عليؑ أنه قال: الناس ثلاثة: عالمٌ رَبَّانِيٌّ، ومتعلمٌ على

سبيل النجاة، وهمجٌ رَعَاعٌ أتباع كل ناعق. قال: والرَّبَّانِيُّ: العالی الدرجة فی العلم.“^(۲۷۸)
(سیدنا علیؑ سے روایت ہے کہ لوگوں کی تین قسمیں ہیں: ربانی عالم، متعلم جو نجات کی راہ پر گام زن ہے اور باقی لوگ رذیل اور بازاری ہیں جو ہر پروپیگنڈہ کرنے والے کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ پھر فرمایا رَبَّانِيٌّ وہ ہے جو علم میں سب سے بڑا ہو۔) جو الیٰقی لکھتے ہیں: ”والرَّبَّانِيُّونَ ، قال أبو عبيد: أحسب الكلمة ليست بعربية، إنما هي عبرانية أوسريانية.“^(۲۷۹) (ابو عبید کہتے ہیں کہ میرے نزدیک رَبَّانِيٌّ بنیادی طور پر عربی کلمہ نہیں ہے، بلکہ یہ عبرانی یا سریانی زبان کا لفظ ہے۔) خفاجی لکھتے ہیں: ”رَبَّانِيُّونَ: أي علماء، قيل: هي عبرانية معربة لأن العرب لاتعرفها.“^(۲۸۰) (رَبَّانِيُّونَ کے معنی علما کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عبرانی

۲۷۷- راغب اصفہانی، المفردات، ص ۱۸۳

۲۷۸- ازہری، تہذیب اللغة، مادہ: رب

۲۷۹- جو الیٰقی، المعرب، ص ۳۳۰

۲۸۰- خفاجی، شفاء الغلیل، ص ۱۶۰

زبان سے معرب ہوا ہے۔ بنیادی طور پر عرب اس سے واقفیت نہیں رکھتے۔) ابن تیمیہ کو اس راے سے اختلاف ہے کہ یہ سریانی یا عبرانی لفظ ہو، چنانچہ لکھتے ہیں: ”قلت: اللفظة عربية منسوبة إلى ربان السفينة الذي ينزلها ويقوم لمصلحتها، ولكن العرب في جاهليتهم لم يكن لهم ربانيون، لأنهم لم يكونوا على شريعة منزلة من الله.“^(۲۸۱) (میں) حافظ ابن تیمیہ) کہتا ہوں کہ یہ عربی زبان کا لفظ اور ربان السفينة (کشتی کا ناخدا) کی طرف منسوب ہے، جو کشتی کو بہ خیر و خوبی اپنے منزل کی طرف لے جاتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عربوں کا کوئی ربان نہیں تھا اس لیے کہ وہ کسی منزل من اللہ شریعت پر نہیں تھے۔)

رَبِّيُونَ

﴿وَكَايِنٍ مِّن نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رَبِّيُونَ كَثِيرٌ﴾^(۲۸۲) (اور کتنے انبیاء گزرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی۔) راغب لکھتے ہیں: ”فَالرَّبِّيُّ كَالرَّبَّانِيِّ.“^(۲۸۳) (رَبِّيُّ، رَبَّانِيٌّ كِي طَرَحْ هِـ) امام بخاری لکھتے ہیں: ”رَبِّيُّونَ، الْجَمِيعُ، وَالْوَاحِدُ: رَبِّيُّ.“^(۲۸۴) (رَبِّيُّونَ كِي مَعْنَى جَمَاعَتُوْنَ كِي هِـ، جَس كَا وَاحِد رَّبِّيُّ هِـ) ابن حجر لکھتے ہیں: ”یہ معنی اصل میں ابو عبیدہ سے منقول ہیں“^(۲۸۵) بیضاوی لکھتے ہیں: ”الرَّبِّيُّ مَنْسُوبٌ إِلَى الرَّبِّيَّةِ، وَهِيَ الْجَمَاعَةُ، لِلْمَبَالِغَةِ.“^(۲۸۶) (رَبِّيُّ، رَبَّةٌ كِي طَرَفٌ بِه طَوْر مَبَالِغَةٍ مَنْسُوبٌ هِـ جَس كِي مَعْنَى جَمَاعَتِ كِي هِـ) سیوطی نے ابو حاتم احمد بن حمدان لغوی کی کتاب الزینة کے حوالے سے

۲۸۱- ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج ۱، ص ۸۲

۲۸۲- آل عمران: ۱۳۶

۲۸۳- راغب اصفہانی، مرجع سابق، ص ۱۸۳

۲۸۴- صحیح البخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب أمن الرسول بما أنزل إليه من ربه

۲۸۵- عسقلانی، فتح الباری، ج ۸، ص ۲۰۸

۲۸۶- بیضاوی، تفسیر البيضاوي، ج ۲، ص ۴۱

لکھا ہے کہ یہ سریانی لفظ ہے۔^(۲۸۷) اس کی ایک قراءت رَبِّيُونَ ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ: ”الرَّبِّيُونَ نُسَبُوا إِلَى الرَّبَّةِ، وَالرَّبَّةُ: عَشْرَةُ آلَافٍ.“^(۲۸۸) (رَبِّيُونَ، رَبَّةٌ کی طرف منسوب ہے۔ رَبَّةٌ کا لفظ دس ہزار کے لیے بولا جاتا ہے۔) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: ”رَبِّيُونَ بمعنی الألوْف والجماعة الكثيرة، وهو بهذا المعنى مأخوذٌ من الرَّبَّةِ ومعناها عَشْرَةُ آلَافٍ.“^(۲۸۹) (اس کے معنی ہزاروں افراد پر مشتمل ایک بڑی جماعت کے ہیں۔ یہ رَبَّةٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی دس ہزار کے ہیں۔)

الرَّسُّ

قرآن مجید میں دو جگہ: سورة الفرقان: ۳۸، سورة ق: ۱۲ میں یہ لفظ مستعمل ہے۔ رَسُّ کے معنی کنویں کے ہیں۔ مجاہد نے اس کا یہی معنی کیا ہے۔^(۲۹۰) امام بخاری لکھتے ہیں: ”الرَّسُّ: الْمَعْدِنُ، جمعه: رِسَاسٌ“^(۲۹۱) (رَسُّ کے معنی مَعْدِنٌ (کان) کے ہیں اور اس کی جمع رِسَاسٌ ہے۔) ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں: یہ ابو عبیدہ کا قول ہے، جب کہ خلیل کہتے ہیں کہ: ”الرَّسُّ كُلُّ بَثْرَتِكُونٍ غَيْرِ مَطْوِيَةٍ.“^(۲۹۲) (ہر وہ کنواں جس کی کوٹھی پختہ تعمیر نہ کی جائے رَسُّ کہلاتا ہے۔) محمود بن حمزہ کرمانی لکھتے ہیں: الرَّسُّ عجمي نام ہے۔^(۲۹۳)

۲۸۷- سیوطی، الإتيان في علوم القرآن، ج ۱، ص ۱۸۱

۲۸۸- ازہری، مرجع سابق، ج ۱۵، ص ۱۳۰

۲۸۹- عبدالرحیم، هامش المعرب، ص ۳۳۲

۲۹۰- ابن ابی حاتم، تفسیر ابن ابی حاتم، ج ۸، ص ۲۶۹۵

۲۹۱- امام بخاری، صحیح البخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورة الفرقان

۲۹۲- عسقلانی، مصدر سابق، ج ۸، ص ۲۹۱

۲۹۳- محمود بن حمزہ کرمانی، غرائب التفسیر، ج ۲، ص ۸۱۶؛ سیوطی، مرجع سابق، ج ۱، ص ۱۸۱

الرَّقِيمُ

﴿ أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيمِ كَانُوا مِنْ آيَاتِنَا عَجَبًا ﴾^(۲۹۴) (کیا تم نے کہف و رقیم والوں کو ہماری نشانیوں میں سے کچھ بہت عجیب خیال کیا؟) ابن دُرَید نے رَقِيمُ کے معنی دوات کے کیے ہیں۔^(۲۹۵) سیوطی نے شیدہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ رومی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی لوح یعنی تختی کے ہیں۔^(۲۹۶) ڈاکٹر محمد تونسجی لکھتے ہیں: ”رقیم کے معنی: تختی یا دوات کے ہیں یا یہ کسی گاؤں یا پہاڑ کا نام ہے اور یہ رومی زبان کا لفظ ہے۔“^(۲۹۷) اصحابِ کہف کو اصحابِ کہف و رقیم اس لیے کہا گیا کہ عرب کے اہل کتاب میں یہ لوگ اسی لقب سے معروف تھے۔ غار میں پناہ لینے کی وجہ سے اُن کی نسبت اس کی طرف کی گئی۔ رہی رقیم کی طرف نسبت، تو اس کے بارے میں مفسرین کے ہاں کئی اقوال ہیں۔ کعب الاحبار کا خیال تھا کہ رقیم اُس بستی کا نام ہے جس سے نکل کر اصحابِ کہف نے غار میں پناہ لی۔ رقیم وادی کو بھی کہتے ہیں: جدید تحقیقات کی بنیاد پر دورِ حاضر کے بعض اہل علم محققین نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ رقیم وہی شہر ہے جسے بیٹرا کے نام سے شہرت ملی اور عرب اسے بطرا کہتے ہیں۔

رَمَزٌ

ابن فارس لکھتے ہیں: ”الرَّاءُ وَالْمِيمُ وَالزَّاءُ أَصْلٌ وَاحِدٌ يَدُلُّ عَلَى حَرَكَةٍ وَاضْطِرَابٍ.“^(۲۹۸) (الرَّمَزُ کے اصلی معنی جنبش، حرکت اور اضطراب کے ہیں۔) راغب لکھتے ہیں: ”الرَّمَزُ: إِشَارَةٌ بِالسَّنَفَةِ، وَالصَّوْتُ الْحَفِيّ، وَالْعَمَزُ بِالْحَاجِبِ، وَعُبِّرَ عَنْ كُلِّ كَلَامٍ كِإِشَارَةٍ بِالرَّمَزِ كَمَا عَبَّرَ عَنِ الشُّكَايَةِ

۲۹۴- الکہف: ۹

۲۹۵- ابو بکر بن حسن بن درید ازدی، الاشتقاق، ت: عبدالسلام محمد ہارون، بیروت، دار الجلیل، ط ۱، ۱۴۱۱ھ-۱۹۹۱ء، ص ۷۲

۲۹۶- سیوطی، مرجع سابق، ج ۱، ص ۱۸۱

۲۹۷- تونسجی، المغرب والدخیل، ص ۱۹۶

۲۹۸- ابن فارس، معجم مقاییس اللغة، مادہ: رمز

بِالْعَمَزِ. “ (۲۹۹) رَمَزٌ کے معنی ہیں: لبوں سے اشارہ کرنے، مخفی آواز اور ابرو کے ذریعہ ایما کے، نیز ہر وہ بات جو اشارہ کی طرح ہو اُسے رَمَزٌ سے تعبیر کیا گیا ہے جس طرح شکایت کی تعبیر عَمَزٌ سے کی گئی ہے۔) ابن جوزی لکھتے ہیں: ”بَلْغَةَ النَّبَطِ: الرَّمَزُ: الإِيَاءُ“ (۳۰۰) (نبٹی زبان میں رَمَزٌ کے معنی اشارہ کے ہیں۔) سیوطی لکھتے ہیں: ”عَدَهُ ابْنُ الْجَوْزِيِّ فِي فَنُونِ الْأَفْنَانِ مِنَ الْمَعْرَبِ، وَقَالَ الْوَاسِطِيُّ: هُوَ تَحْرِيكُ الشَّفْتَيْنِ بِالْعِبْرِيَّةِ.“ (۳۰۱) (ابن جوزی نے فنون الأفنان میں اس لفظ کو معرب میں شمار کیا ہے اور واسطی کہتے ہیں: عبرانی زبان میں اس کے معنی ہونٹ ہلانے کے ہیں۔) قرآن مجید میں ہے: ﴿قَالَ أَيَّتُكَ إِلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمَزًا﴾ (۳۰۲) (فرمایا: تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تو تین دن لوگوں سے بات نہ کر سکے گا مگر اشارے سے۔)

رَهُوٌ

﴿وَأَتْرِكُ الْبَحْرَ رَهُوًّا إِيْتَهُمْ جُنْدٌ مُعْرِفُونَ﴾ (۳۰۳) (اور دریا کو ساکن چھوڑ دو، یہ ڈوبنے والی فوج بنیں گے۔) ابن فارس لکھتے ہیں: اس لفظ کے بنیادی طور پر دو معنی ہیں: ”يُدُلُّ أَحَدَهُمَا عَلَى دَعَاةٍ وَخَفْضٍ وَسُكُونٍ، وَالْآخِرُ عَلَى مَكَانٍ قَدْ يَنْخَفِضُ وَيَرْتَفِعُ.“ (۳۰۴) (جن میں سے ایک اطمینان و سکون پر دلالت کرتا ہے اور دوسرا معنی اُس جگہ پر جو کبھی بلند ہو جاتی ہو اور کبھی پست۔) سیوطی لکھتے ہیں: ”قال أبو القاسم في قوله تعالى: ﴿وَأَتْرِكُ الْبَحْرَ رَهُوًّا﴾ أي: سهلاً دمتاً، بَلْغَةَ النَّبَطِ، وقال الواسطي: أي ساكناً بالسبانية.“ (۳۰۵) (ابو القاسم نے فرمان الہی: ﴿وَأَتْرِكُ الْبَحْرَ رَهُوًّا﴾ کے معنی یہ بیان کیے

۲۹۹- راغب اصفہانی، مرجع سابق، ص ۲۰۳

۳۰۰- ابن جوزی، فنون الأفنان، ص ۱۱۷

۳۰۱- سیوطی، مرجع سابق، ج ۱، ص ۱۸۱

۳۰۲- آل عمران: ۴۱

۳۰۳- الدخان: ۲۴

۳۰۴- ابن فارس، مصدر سابق، ص ۴۰۴

۳۰۵- سیوطی، مرجع سابق، ج ۱، ص ۱۸۱

ہیں کہ نبطی زبان میں اس کے معنی اُس دریا کے ہیں جو ساکن اور جوش و خروش کے بغیر ہو، جب کہ واسطی کہتے ہیں کہ سریانی میں اس کے معنی ساکن دریا کے ہیں۔) مفسر قرطبی لکھتے ہیں: ”ہومن نعت البحر، أي: أتركه ساکنًا كما هو قد انفرد، فلا تأمره بالانضمام حتى يدخل فرعون وقومه.“ (۳۰۶) (رہو یہاں دریا کی صفت کے طور پر واقع ہوا ہے یعنی دریا (کے پانی) کو ویسا ہی کھڑا رہنے دیجیے اور اسے پہلے کی طرح منضم اور باہم دگرپوست ہو جانے کا حکم نہ دیں یہاں تک کہ فرعون اور اس کا لشکر اس میں داخل ہو جائے۔)

الرُّومُ

روم کے نام سے قرآن مجید میں ایک سورت ہے، جس میں مذکور ہے کہ: ﴿الْمَغْلَبَاتُ الْرُّومِ * فِي آذَانِ الْأَرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ * فِي بَيْضِ سِينِينَ﴾ (الف، لام، میم۔ رومی پاس کے علاقے میں مغلوب ہوئے اور وہ اپنی مغلوبیت کے بعد عن قریب چند سالوں میں غالب آجائیں گے۔) آذَانِ الْأَرْضِ سے مراد یہاں شام و فلسطین کی سرزمین ہے جو عرب کی سرزمین سے بالکل متصل تھی۔ اس علاقے پر اس زمانے میں رومیوں کی حکومت تھی، لیکن وہ اس وقت سخت اندرونی خلفشار میں مبتلا تھے جس سے فائدہ اٹھا کر ایرانیوں نے ان پر حملہ کر دیا اور ان علاقوں سے ان کو بے دخل کر دیا۔ یہ واقعہ ۶۱۴ء یعنی نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے چھٹے یا ساتویں سال پیش آیا۔ غَلَبَ اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے۔ یہ قرآن مجید نے پیشین گوئی فرمائی کہ اگرچہ رومی اس وقت مغلوب ہو گئے ہیں، لیکن یہ مغلوبیت اُن کی عارضی ہے۔ بہت جلد وہ ایرانیوں پر غالب ہو جائیں گے اور اس انقلاب میں، جس کی قرآن مجید خبر دے رہا ہے، زیادہ دن نہیں لگیں گے، صرف چند سالوں کے اندر اندر یہ واقعہ ہو جائے گا۔ جو الیقئ لکھتے ہیں: ”الرُّومُ: هذا الجليل من الناس أعجمي، وقد تكلمت به العرب قديمًا و نطق به القرآن.“ (۳۰۸) (روم: عجمی لفظ ہے۔ انسانوں کے خاندان اور نسل کے لیے مستعمل ہے۔ عرب زمانہ قدیم سے اس سے آشنا ہیں اور اسے قرآن مجید نے بھی استعمال

۳۰۶- قرطبی، تفسیر القرطبی، ج ۱۶، ص ۱۲۰

۳۰۷- الروم: ۱-۲

۳۰۸- جو الیقئ، المعرب، ص ۳۳۵

کیا ہے۔) جوہری لکھتے ہیں: ”والرُّومُ هم من ولد الرُّومِ بنِ عيصو يقال: رُوميٌّ ورُومٌ، مثل زنجي وزنج، فليس بين الواحد والجمع إلاَّ الياء المشددة.“^(۳۰۹) (روم بن عيصو کی اولاد روم کہلاتی ہے، جب کہ ان میں سے واحد کے لیے رومی کا لفظ مستعمل ہے، جیسا کہ زنجی اور زنج مستعمل ہے، ان میں واحد اور جمع میں تمیز وجدائی کے لیے یائے مشددا استعمال کیا جاتا ہے۔) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: ”ہو باللاتينية Roma اسم رومية سمي باسم مؤسسها الأسطوري وأول ملوكها Romulus.“^(۳۱۰) (لاطینی زبان میں اسے Roma کہا جاتا ہے، اس کے افسانوی بادشاہ کے نام پر اس کا نام رکھا گیا، اس کے بادشاہ اول کا نام Romulus تھا۔)

زَبَانِيَّةٌ

﴿سَنَدُ الزَّبَانِيَّةِ﴾^(۳۱۱) (ہم موکلانِ دوزخ کو بلائیں گے۔) یہ اُن سرکشوں کو چیلنج ہے کہ اگر کسی کو اپنی قوت و جمعیت پر بڑا ناز ہے تو وہ اپنی ٹولی کو بلائیں ہم بھی اپنی ٹولی کو بلائیں گے اور دیکھیں گے کہ اُن کے اندر کتنا زور ہے۔ اس چیلنج کا عملی مظاہرہ سب سے پہلے معرکہ بدر میں ہوا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ کی ٹولی کے آگے قریش کی پوری قوت و جمعیت کس طرح غبار بن کر اڑ گئی۔ ڈاکٹر عبدالرحیم تو نجی لکھتے ہیں: ”واحدھا زَبَانِيَّةٌ، وَهُم الملائكة الغلاظُ وقيل: المتمردون من الإنس والجن، وَسُمُّوا السُّرَطَ زَبَانِيَّةٌ، واحدهم زَابِنٌ... ذلك كله من: ”زَبَان: اللسان“ بالفارسية.“^(۳۱۲) (اس کا واحد زَبَانِيَّةٌ ہے، جس کے معنی سخت اور درشت ٹھولانکہ کے ہیں۔ یہ بھی ایک قول ہے کہ جن و انس میں متمردين اور سرکشوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ پولیس اور پیادوں کے لیے بھی یہ لفظ مستعمل ہے، جس کا واحد زَابِنٌ ہے اور یہ سب فارسی کے ”زَبَان“ سے ماخوذ ہیں۔)

۳۰۹- جوہری، الصحاح، مادہ: روم

۳۱۰- عبدالرحیم، المعرب، ص ۳۳۶

۳۱۱- العلق: ۱۸

۳۱۲- تو نجی، المعرب والدخيل، ص ۱۹۷

زَرَابِيٌّ

قرآن مجید میں ہے: ﴿وَزَرَابِيٌّ مَبْنُوْنَةٌ﴾^(۳۱۳) (اور غالیچے ترتیب سے لگے ہوئے۔) زَرَابِيٌّ، زُرْبِيَّةٌ کی جمع ہے۔ یہ تکیوں اور غالیچوں کے معنی میں آتا ہے یعنی قالینوں پر تکیے اور غالیچے ہر طرف بکھرے پڑے ہوں گے۔ بیٹھنے والا جہاں بیٹھے وہ اس کے لیے آسائش کا باعث ہوں گے۔ ڈاکٹر محمد تونسجی لکھتے ہیں: ”ہي الطَّنَافِسُ الْفَاحِرَةُ، واحدها زُرْبِيَّةٌ، من الفارسية زَر: ذَهَبٌ وبافته منسوجٌ.“^(۳۱۴) (یہ نہایت قیمتی غالیچوں (پچھونایا قالین) کو کہا جاتا ہے، اس کی واحد زُرْبِيَّةٌ ہے۔ فارسی زبان کے ”زر بفت“ کا معرب ہے۔ یعنی سونے سے بنی ہوئی؛ زر بمعنی: سونا اور بافته کے معنی منسوج یعنی بُنی ہوئی۔)

زَكَرِيَّا عَلَيْهِ السَّلَامُ

ابن درید، جو الیقنی اور خفاجی لکھتے ہیں: ”اسم أعجمي، وهو معربٌ.“^(۳۱۵) (عجمی نام اور معرب ہے۔) ڈاکٹر عبد الرحیم لکھتے ہیں: ”عبرانی میں اس کی اصل زَخْرِيَاہ اور سریانی میں زَخْرِيَا ہے۔“^(۳۱۶)

قرآن مجید نے الأنعام: ۸۵ میں انبیاء بنی اسرائیل کے ضمن میں سیدنا زکریا علیہ السلام کا نام بھی لیا ہے۔ ان کے متعلق آل عمران: ۳۷-۴۱، مریم: ۱-۵ اور الانبیاء: ۸۹-۹۰ میں مذکور ہے کہ وہ خود عمر رسیدہ تھے اور ان کی بیوی عاقر، لیکن ان کی بیوی میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی گئی، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وَزَكَرِيَّا إِذْ نَادَى رَبَّهُ، رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ﴾ * فَاسْتَجَبْنَا لَهُ، وَوَهَبْنَا لَهُ، يَحْيَىٰ وَأَصْلَحْنَا لَهُ، زَوْجَهُ﴾^(۳۱۷) (اور زکریا (پر بھی فضل کیا) کہ جب اُس نے اپنے

۳۱۳- الغاشية: ۱۶

۳۱۴- تونسجی، مرجع سابق، ص ۱۹۷

۳۱۵- ابو بکر محمد بن الحسن بن درید، جہرۃ اللغۃ، ج ۲، ص ۳۲۴، جو الیقنی، المعرب، ص ۳۴۹؛ خفاجی، شفاء الغلیل، ص ۱۶۷

۳۱۶- عبد الرحیم، مرجع سابق، ص ۳۴۹

۳۱۷- الأنبياء: ۸۹-۹۰

رب کو پکارا کہ اے رب! تو مجھے تہانہ چھوڑ اور بہترین وارث تو ہے، تو ہم نے اُس کی دعا قبول کی اور ہم نے اُس کو
بچی عطا کیا اور اُس کی بیوی کو اس کے لیے سازگار کر دیا۔)

زَمْهَرِيرٌ

قرآن مجید میں جنت کے بارے میں ہے: ﴿لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَلَا زَمْهَرِيرًا﴾^(۳۱۸) (اس میں نہ تو سخت
گرمی دیکھیں گے اور نہ سخت سردی۔) سورج اور زَمْهَرِيرٌ نہ دیکھنے کا مفہوم یہ ہے کہ جنتی گرمی اور سردی دونوں
کی اذیتوں سے بالکل محفوظ اور جنت کے تختوں پر برابر اجماع ہوں گے۔ ان کے سورج میں روشنی اور قوت بخشی
تو ہوگی مگر اس میں حدّت و تمازت نہ ہوگی۔ اسی طرح وہاں کا موسم ہمیشہ خوش گوار، معتدل اور پُر بہار رہے گا۔
خرماں کی نحوست اور بادِ زمہریر کے آزار سے ان کو کبھی سابقہ پیش نہیں آئے گا۔ ڈاکٹر محمد تونسجی لکھتے ہیں:
”المعنى: شدة البرودة، من الفارسية زَم: الريح الباردة، وهري: مكان يُروى بهاء المطر.“^(۳۱۹)
(زمہریر کے معنی سردی کی شدت کے ہیں۔ فارسی زبان سے ماخوذ ہے۔ زَم کے معنی بج بستا ہوا کے ہیں اور
هري ایسی جگہ ہے جہاں بہ کثرت بارش برستی ہو۔)

زَنْجَبِيلٌ

ایک قسم کی جڑ ہے جو زمین میں ہوتی ہے۔ عربی میں زَنْجَبِيلٌ، سندھی میں سنڈھ اور انگریزی میں
Ginger کہلاتا ہے۔ اردو میں ترکوادرک اور خشک کو سوٹھ کہتے ہیں۔^(۳۲۰) جو الیٹی لکھتے ہیں: ”والعرب تصفه
بالطيب.“^(۳۲۱) (عربوں کے ہاں یہ اعلیٰ درجے کی خوش بودار چیز شمار ہوتی ہے۔) قرآن مجید میں ہے:

۳۱۸- الدهر: ۱۳

۳۱۹- تونسجی، مرجع سابق، ص ۱۹۷

۳۲۰- حکیم مظفر حسین اعوان، کتاب المفردات المعروف خواص الادویہ، ص ۶۸

۳۲۱- جو الیٹی، المعرب، ص ۳۵۵

﴿وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَتْ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا﴾^(۳۲۲) (اور وہ اس میں ایک اور شراب بھی پلائے جائیں گے جس میں ملوئی چشمہ زنجبیل کی ہوگی۔) خفاجی لکھتے ہیں: ”مُعَرَّبٌ، وهو عروقٌ في الأرض، وليس شجرًا ولا نبتًا كما ظنَّه الدينوري... وقيل: هو عربي منحوتٌ من: زَنْأٌ في الجبلِ إذا صعده، وهو بعيدٌ.“^(۳۲۳) (معرب ہے۔ زمین کے اندر ایک جڑ کو کہتے ہیں۔ شجر و نبات کا نام نہیں جیسا کہ دینوری کا خیال ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ عربی زبان کا لفظ ہے اور زَنْأٌ في الجبلِ سے ماخوذ ہے جس کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں، لیکن یہ قول بعید ہے۔) ڈاکٹر عبد الرحیم لکھتے ہیں: ”یہ فارسی لفظ شنکییل، یا شنکویر، یا شنکبیر یا شنکویل“ کا معرب ہے۔^(۳۲۴) موجودہ فارسی میں اسے شنکویر (شَسْ نَ گَ وِی ر) کہا جاتا ہے۔

سُجَّدًا

قرآن مجید میں ہے کہ: ﴿وَادْخُلُوا أَبْوَابَ سُجَّدًا﴾^(۳۲۵) (اور دروازے میں سر جھکائے ہوئے داخل ہو جاؤ۔) سجدہ کے اصل معنی سر جھکانے کے ہیں۔ اس سر جھکانے کے مختلف درجے ہو سکتے ہیں۔ اس کی کامل شکل زمین پر پیشانی رکھ دینے کے ہیں جو ہم نماز میں اختیار کرتے ہیں۔ اس آیت میں اس سے مراد صرف سر جھکانا ہے۔ موقع کلام اس کی دلیل ہے۔ سیوطی نے واسطی کے حوالے سے لکھا ہے کہ: ”سُجَّدًا أَي: مُقْنَعِي الرَّءُوسِ، بالسريانية.“^(۳۲۶) (سریانی زبان میں سُجَّدًا کے معنی ہیں: سر جھکائے ہوئے یا سر چھپائے ہوئے۔) ڈاکٹر محمد تونجی کی بھی یہی رائے ہے۔^(۳۲۷)

۳۲۲- الدهر: ۱۷

۳۲۳- خفاجی، شفاء الغلیل، ص ۱۶۸

۳۲۴- عبد الرحیم، مرجع سابق، ص ۳۵۵

۳۲۵- البقرة: ۵۸

۳۲۶- سیوطی، الإتيان، ج ۱، ص ۱۸۱

۳۲۷- تونجی، مرجع سابق، ص ۱۹۷

له السجل، قال: والأية مكية ولم يكن لرسول الله كاتبٌ بمكة. (۳۳۲) (میں نے اپنے شیخ ابوالعباس ابن تیمیہ سے سنا ہے کہ یہ روایت موضوع ہے اور رسول اللہ ﷺ کا سجل نامی کوئی کاتب نہیں تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی اس نام کا کوئی شخص نہیں پایا جاتا۔ رسول اللہ ﷺ کے سارے کاتب معروف و مشہور ہیں، جن میں سجل نام کا کوئی کاتب نہیں، نیز یہ آیت مکی ہے اور مکہ مکرمہ میں رسول اللہ ﷺ کا کوئی کاتب نہیں تھا۔) ابن کثیر لکھتے ہیں: ”هذا منكرٌ جداً، لا يصحُّ أصلاً، وقد صرح جماعة من الحفاظ بوضعه وإن كان في سنن أبي داود، منهم شيخنا الحافظ الكبير أبو الحجاج المزي، وقد أفردت لهذا الحديث جزءاً على حدته والحمد لله.“ (۳۳۳) (یہ روایت شدید منکر ہے اور قطعی طور پر صحیح نہیں۔ یہ روایت اگرچہ سنن ابی داود میں ہے لیکن حفاظ کی ایک جماعت نے اس کے موضوع ہونے کی صراحت کی ہے۔ ہمارے شیخ حافظ کبیر ابوالحجاج مزی بھی ان میں سے ہیں۔ میں نے بھی بحمد اللہ تعالیٰ اس حدیث سے متعلق ایک علاحدہ جز لکھا ہے۔) انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ: ”قد عرضتُ هذا الحديث على شيخنا الحافظ الكبير أبي الحجاج المزي فأنكره جداً، وأخبرته أن شيخنا العلامة أبا العباس ابن تيمية كان يقول: هو حديثٌ موضوعٌ، وإن كان في سنن أبي داود، فقال شيخنا المزي: وأنا أقوله.“ (۳۳۴) (میں نے اپنے شیخ حافظ کبیر ابوالحجاج مزی کے سامنے یہ حدیث بیان کی تو انھوں نے اسے شدید منکر جانا اور میں نے انھیں بتایا کہ ہمارے شیخ ابوالعباس ابن تیمیہ کہا کرتے تھے کہ یہ روایت موضوع ہے اگرچہ یہ سنن ابی داود میں ہے، تو ہمارے شیخ مزی نے فرمایا: میں بھی اسے موضوع کہتا ہوں۔) ذہبی نے اس کے ایک اور طریق (۳۳۵) کو حمدان بن سعید بغدادی کے ترجمہ میں نقل کر کے لکھا ہے: ”أتى بخبر كذب.“ (۳۳۶) (اس نے ایک جھوٹی

۳۳۲- ابن تیم، تہذیب السنن، ریاض، مکتبۃ المعارف للنشر و التوزیع، ج ۴، ص ۲۹۹

۳۳۳- ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، ج ۳، ص ۲۶۹

۳۳۴- ابن کثیر، البدایة والنہایة، ج ۵، ص ۳۲۱

۳۳۵- خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، ج ۸، ص ۱۷۵

۳۳۶- ذہبی، میزان الاعتدال، ج ۱، ص ۶۰۲

روایت بیان کی ہے۔) ابن حجر نے اس پر استدراک کرتے ہوئے لکھا ہے: ”وہذا المتن لا يجوز أن يطلق عليه الكذب فقد رواه النسائي في التفسير وأبو داود في السنن من طريق أخرى عن ابن عباس رضي الله عنه، وأما هذه الطريق فتفرّد بها حمدان، لكن لم أر من ضعفه قبل المؤلف.“^(۳۳۷) (اس متن پر کذب کا اطلاق اور استعمال جائز نہیں، اسے نسائی نے کتاب التفسیر میں اور ابو داود نے سنن میں سیدنا ابن عباس رضي الله عنه کے طریق سے نقل کیا ہے۔ اس طریق میں حمدان متفرد ہے لیکن میں نے مؤلف (حافظ ذہبی) سے پہلے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا ہے جس نے اسے ضعیف کہا ہو۔) اس پر البانی نے لکھا ہے کہ: ”فهل رأيت من وثقه، ألا يكفي أنه مجهول؟ لم تعرفه، وأنت الحافظ، إلا في هذه الرواية المنكرة.“^(۳۳۸) (کیا آپ نے کوئی ایسا محدث دیکھا ہے جس نے حمدان کی توثیق کی ہو؟ کیا یہ کافی نہیں کہ یہ مجهول راوی ہے؟ حافظ ہونے کے باوجود آپ بھی اس راوی کو صرف اس منکر روایت میں جانتے ہیں، کسی اور روایت میں نہیں۔) ابن حجر نے اس روایت کے طرق پیش کر کے لکھا ہے: ”فهذا الحديث صحيح بهذه الطرق، وغفل من زعم أنه موضوع.“^(۳۳۹) (ان طرق کے پیش نظریہ حدیث صحیح ہے اور جس نے اسے موضوع کہا ہے، غفلت و وہم کا شکار ہو کر کہا ہے۔)

البانی لکھتے ہیں:

وأما تصحيح الحافظ إياه فهو غفلة منه عما تقدّم نقله عن الحفاظ الذين أبطلوه بالنظر إلى متنه، وبخاصة قول شيخ الإسلام ابن تيمية: والآية مكية، ولم يكن لرسول الله صلى الله عليه وسلم كاتب بمكة، فوجود مثل هذه النكارة في الحديث مما يجعل النفس لا تطمئن لصحته من حيث إسناده، ولا سبباً ومداره على مجهولين و متهم بالكذب.^(۳۴۰)

۳۳۷- عسقلانی، لسان الميزان، ج ۲، ص ۳۵۶

۳۳۸- ناصر الدین البانی، سلسلۃ الأحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ، ریاض، دار المعارف، ط ۱، ۱۲۱۲ھ-۱۹۹۲ء، ج ۱۲،

ص ۲۰۲

۳۳۹- ابن حجر عسقلانی، الإصابة به تمييز الصحابة، بیروت، دار الکتب العلمیة، ط ۱، ۱۴۱۵ھ، ج ۳، ص ۲۹

۳۴۰- ناصر الدین البانی، مرجع سابق، ج ۱۲، ص ۲۰۲

حافظ ابن حجر نے وہم و غفلت کا شکار ہو کر اس حدیث کو صحیح کہا ہے، اس لیے کہ حفاظ حدیث (ابن تیمیہ، مزی، ابن کثیر) نے اس کے متن کو مد نظر رکھ کر اسے باطل کہا ہے اور بالخصوص ابن تیمیہ کا یہ ارشاد کہ یہ آیت مکی ہے اور مکہ مکرمہ میں رسول اللہ ﷺ کا کوئی کاتب نہیں تھا۔ روایت میں اس نکارت کی موجودگی کے باعث دل اس کو صحیح کہنے پر مطمئن نہیں ہوتا اور سند کے لحاظ سے اس کا کوئی طریق مہول یا متہم بالکذب راوی سے خالی نہیں تو اسے کیوں کر صحیح تسلیم کیا جائے؟

ابن جریر لکھتے ہیں: ”السَّجِلُّ فِي هَذَا الْمَوْضِعِ: الصَّحِيفَةُ، لِأَنَّ ذَلِكَ هُوَ الْمَعْرُوفُ فِي كَلَامِ الْعَرَبِ، وَلَمْ يَعْرِفْ لِنَبِيِّنَا كَاتِبَ اسْمِهِ السَّجِلُّ، وَلَا فِي الْمَلَائِكَةِ مَلِكٌ ذَلِكَ اسْمُهُ.“^(۳۳۱) (یہاں سِجِلُّ کا معنی صحیفہ ہے، اس لیے کہ کلام عرب میں یہی مشہور و معروف ہے۔ ہمارے نبی ﷺ کا سِجِلُّ نامی کوئی کاتب معروف نہیں اور نہ ملائکہ میں اس نام کا کوئی فرشتہ موجود ہے۔)

سِجِلُّ

قرآن مجید میں ہے: ﴿تَرْمِيهِم بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ﴾^(۳۳۲) (وہ اُن کو سنگِ گل کے قسم کے پتھروں سے مارتے تھے۔) یہ بھی وہی فارسی سے معرب اور وہی سنگِ گل ہے جو عربی میں آکر سِجِّيلُ بن گیا۔ ابن قتیبہ، جو الیٰقی اور فریابی نے اسے فارسی کا سنگِ گل ہی تسلیم کیا ہے۔^(۳۳۳)

سِجِّينٌ

﴿كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْفُجَارِ لَفِي سِجِّينٍ * وَمَا أَدْرَاكَ مَا سِجِّينٌ * كِتَابٌ مَّرْقُومٌ﴾^(۳۳۴) (ہرگز نہیں، فاجروں کے اعمال نامے سِجِّین میں ہوں گے اور تم کیا جانو کہ سِجِّین کیا ہے؟ لکھا ہوا دفتر۔) سِجِّین یہاں اپنے لغوی مفہوم میں نہیں بلکہ ایک نام کے طور پر آیا ہے۔ وَمَا أَدْرَاكَ مَا سِجِّينٌ کا اسلوب سِجِّین کی خوف ناک کو ظاہر کرنے کے لیے اختیار فرمایا گیا ہے کہ تم کیا سمجھے کہ سِجِّین کیا ہے! اس کو کوئی معمولی چیز نہ سمجھو۔ وہ تباہ ہوا جس کا نام یا جس کے

۳۳۱- ابن جریر، تفسیر ابن جریر، ج ۹ ص ۹۵

۳۳۲- الفیل: ۴

۳۳۳- ابن قتیبہ، أدب الکاتب، ص ۳۸۲؛ جو الیٰقی، المعرب، ص ۳۶۵؛ سیوطی، الإنقان، ج ۱، ص ۱۸۱

۳۳۴- المطففين: ۷-۹

اعمال اس میں درج ہوئے۔ كِنْبٌ مَرْفُومٌ: وہ لکھا ہوا فقرہ ہے یعنی اس میں تمام مجرموں کا سارا ریکارڈ بہ شکل تحریر محفوظ کیا جاتا ہے۔ ”بہ شکل تحریر“ کی قید سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ نہ اس میں کسی سہو و نسیان کا کوئی امکان ہے اور نہ اس کے حجت ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش۔ سیوطی لکھتے ہیں: ”ذکر أبو حاتم في كتاب الزينة أنه غير عربي“^(۳۳۵) (ابو حاتم نے کتاب الزینۃ میں لکھا ہے کہ یہ غیر عربی لفظ ہے۔)

سَرَابٌ

یہ پانی کی مانند ایک چمکتا ہوا مظہر ہے اور جوں جوں پیاسا اس کی طرف بڑھتا ہے وہ آگے آگے سرکتا چلا ہے۔ پیاسا چلتے چلتے تھک جاتا ہے لیکن اُسے پانی کا گھونٹ تک نہیں ملتا۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَلُوهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيَعَةٍ يُحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَوَجَدَ اللَّهُ عِنْدَهُ فُوقَانَهُ حِسَابًا مَّاءً وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ﴾^(۳۳۶) (اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی تمثیل یہ ہے کہ جیسے چٹیل صحرا میں سراب ہو جس کو پیاسا پانی گمان کرے یہاں تک کہ جب اُس کے پاس آئے گا تو وہاں کچھ نہ پائے گا البتہ اس کے پاس اللہ کو پائے گا بس وہ اس کا حساب چکادے گا اور اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: ”الكلمة فارسيّة، مركبة من: سر: رأس، وآب: ماء.“^(۳۳۷) (فارسی کلمہ سر آب ہے، جو سر اور آب سے مرکب ہے۔)

سِرَاجٌ

قرآن مجید میں ہے: ﴿وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا﴾^(۳۳۸) (اور اس میں ایک چراغ اور ایک منور چاند بنایا۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: ”الكلمة فارسية ”چراغ“ وقيل: سنسكريتية من: سورج: الشمس.“^(۳۳۹) (سراج اصل میں فارسی کا چراغ ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ سنسکرت کے سورج سے ماخوذ ہے۔)

۳۳۵- سیوطی، مرجع سابق، ج ۱، ص ۱۸۱

۳۳۶- النور: ۲۴

۳۳۷- تونجی، المعرب والدخیل، ص ۱۹۸

۳۳۸- الفرقان: ۶۱

۳۳۹- تونجی، مرجع سابق، ص ۱۹۸

سُرَادِقٌ

قرآن مجید میں ہے: ﴿إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا﴾^(۳۵۰) (ہم نے ظالموں کے لیے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قتا میں ان کو گھیر لے گی۔) جو ایسی لکھتے ہیں: ”والسُرَادِقُ: فارسیؓ معربؓ، وأصله بالفارسية: سَرَادَزْ، وهو الدهليز.“^(۳۵۱) (یہ فارسی ہے، معرب، اصل میں سرادر تھا بمعنی درِ سرا اور دہلیز کے۔) خفاجی لکھتے ہیں: ”مُعَرَّبٌ سَرَايِدَةٌ وهو ما يمدُّ فوق صحن الدار والبيت.“^(۳۵۲) (سرا پردہ کا معرب ہے۔ مکان اور صحن پر جسے کھینچ کر پھیلا یا جاتا ہے۔) ڈاکٹر محمد تونسجی لکھتے ہیں: ”الكلمة فارسية بمعنى الدهليز، الرواق، الحاجز حول الخيمة، مركبةٌ من: ”سَر: رأسٌ، وپردہ: سَتَارَةٌ.“^(۳۵۳) (فارسی کلمہ ہے جس کے معنی دہلیز، سائبان اور اُس پردہ کے ہیں جو خیمے کے ارد گرد ڈالا جاتا ہے۔ سر پردہ سے مرکب ہے۔) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: ”الصواب: أنه معرب Srada بالفارسية القديمة وهو بالفارسية الحديثة سَرَا وَسَرَايٌ بمعنى البيت والقصر والبناء العالی.“^(۳۵۴) (درست بات یہ ہے کہ یہ قدیم فارسی Sarda کا معرب ہے جو جدید فارسی میں سر اور سرای ہے جس کے معنی گھر، قصر و بنگلہ اور اونچی عمارت کے ہیں۔) اور ڈاکٹر صلاح الدین المنجد نے مارا فرام کے حوالے سے لکھا ہے: ”إنها سريانية، وليست معربة عن الفارسية وأصلها: Sarodhiqo.“^(۳۵۵) (یہ سریانی ہے۔ فارسی سے معرب نہیں، اس کی اصل Sarodhiqo ہے۔)

۳۵۰- الكهف: ۱۸

۳۵۱- جو ایسی، مرجع سابق، ۳۹۸

۳۵۲- خفاجی، شفاء الغلیل، ص ۱۷۵

۳۵۳- ڈاکٹر تونسجی، مرجع سابق، ۱۹۸

۳۵۴- عبدالرحیم، المعرب، ص ۳۹۹

۳۵۵- ڈاکٹر صلاح الدین المنجد، المفصل فی الألفاظ الفارسية المعربة، ص ۸۶

سَرْدٌ

قرآن مجید میں ہے: ﴿وَأَلْنَا لَهُ الْحَدِيدَ * أَنْ أَعْمَلَ سَدِغَتٍ وَقَدَّرَ فِي السَّرْدِ﴾^(۳۵۶)
 (اور ہم نے اُس کے لیے لوہے کو نرم کر دیا کہ ڈھیلی ڈھالی زرہیں بناؤ۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: ”السَّرْدُ: الدَّرْعُ،
 والكلمة فارسيةٌ أصلها: زَرَه.“^(۳۵۷) (السَّرْدُ: الدَّرْعُ کے معنی میں ہے۔ یہ فارسی کلمہ ہے جو اصل میں
 زرہ ہے۔)

سَرِيٌّ

قرآن مجید میں ہے: ﴿قَدْ جَعَلَ رَبُّكَ تَحَنُّكَ سَرِيًّا﴾^(۳۵۸) (تمہارے پروردگار نے تمہارے نیچے
 ایک چشمہ جاری کر رکھا ہے۔) ابن ابی حاتم نے مجاہد کے حوالے سے لکھا ہے کہ سریانی میں نہر کو سَرِيٌّ کہا جاتا ہے
 اور سعید بن جبیر کے حوالے سے لکھا ہے کہ قبلی زبان میں نہر کو سَرِيٌّ کہتے ہیں۔^(۳۵۹)
 ابن جوزی نے ابوصالح اور ابن جریج^(۳۶۰) کے حوالے سے لکھا ہے: ”هو الجَدْوَلُ بالسريانية.“^(۳۶۱)
 (سریانی زبان میں یہ جَدْوَلُ کو کہا جاتا ہے۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: ”السَّرِيٌّ: الجَدْوَلُ، النَّهْرُ الصَّغِيرُ،

۳۵۶- سبا: ۱۰-۱۱

۳۵۷- تونجی، مرجع سابق، ص ۱۹۸

۳۵۸- مریم: ۲۳

۳۵۹- ابن ابی حاتم، تفسیر ابن ابی حاتم، ج ۷، ص ۲۳۰۵

۳۶۰- عبد الملک بن عبد العزیز بن جریج، ابوالولید / ابو خالد - ۸۰ھ - ۶۹۹ء کو مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے۔ حرم کی کے فقیہ تھے۔
 اپنے زمانے میں اہل حجاز کے امام تھے۔ مکہ مکرمہ میں سب سے پہلے آپ نے علوم میں کتابیں لکھیں۔ ثبت لیکن مدلس
 تھے۔ ۱۵۰ھ - ۷۶۷ء کو مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔ (ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ۱، ص ۱۶۹؛ زرکلی، الأعلام، ج ۴،

ص ۱۶۰)

۳۶۱- ابن جوزی، زاد المسیر، ج ۳، ص ۱۲۶

السید، والكلمة سریانیة، أصلها: سَرِيوُ.“ (۳۶۲) (السَّرِيُّ کے معنی جدول، چھوٹے نہر اور سردار کے ہیں۔ یہ سریانی زبان کا لفظ ہے، جس کی اصل سَرِيوُ ہے۔)

سَفَرَةٌ

قرآن مجید میں ہے: ﴿بِأَيْدِي سَفَرَةٍ * كِرَامٍ بَرَرَةٍ﴾ (۳۶۳) (معزز باوقار کاتبوں کے ہاتھوں میں۔) سیوطی نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے لکھا ہے کہ نبطی زبان میں قراء کو سَفَرَةٌ کہا جاتا ہے۔ (۳۶۳) ڈاکٹر محمد تونسجی لکھتے ہیں: ”السَّفَرَةُ: الملائكةُ الكاتِبونَ، وهم من ينسخون من اللوح المحفوظ، وهم القُرَّاءُ بالنبطية، من الآرامية: Soforo معنی الكاتب.“ (۳۶۵) (السَّفَرَةُ: لکھنے والے ملائکہ، جو لوح محفوظ سے لکھتے ہیں۔ نبطی زبان میں اس کا استعمال قاریوں کے لیے کیا جاتا ہے جو دراصل آرامی زبان کا Soforo ہے جس کے معنی کاتب و منشی کے ہیں۔)

سَقَرٌ

قرآن مجید میں ہے: ﴿سَأْصِلِيهِ سَقَرٌ * وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَقَرٌ * لَا بُدَّيْ وَلَا نَذْرٌ * لَوْ آخِذَةٌ لِلْبَشَرِ﴾ (۳۶۶) (میں اس کو عن قریب دوزخ میں داخل کروں گا۔ اور کیا سمجھے کہ دوزخ کیا ہے؟ نہ ترس کھائے گی اور نہ چھوڑے گی۔ چڑی کو جھلس دینے والی۔) جو الیقنی لکھتے ہیں: ”وسقَر: اسمٌ لنار الآخرة، أعجميٌّ، ويقال: بل هو عربيٌّ، من قولهم: سَقَرَتْهُ الشَّمْسُ إذا أذابتُهُ، سميت بذلك لأنها تذيب الأجسام.“ (۳۶۷)

۳۶۲- تونسجی، مرجع سابق، ص ۱۹۸

۳۶۳- عبس: ۱۵-۱۶

۳۶۴- سیوطی، الإیتقان، ج ۱، ص ۱۸۱

۳۶۵- تونسجی، مرجع سابق، ص ۱۹۸

۳۶۶- المدثر: ۲۶-۲۹

۳۶۷- جو الیقنی، مرجع سابق، ص ۳۹۵

(سقر: آخرت کے آگ کا نام ہے جو عجمی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ عربی زبان کا لفظ ہے اور سَقَرَةٌ الشَّمْسُ کے معنی میں مستعمل ہے، یعنی سورج نے اُسے پگھلا دیا۔ دوزخ کا یہ نام اس لیے پڑا کہ وہ بھی اجسام کو پگھلا دیتی ہے۔) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: ”درست یہ ہے کہ یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔“ (۳۶۸) ڈاکٹر محمد تونسجی لکھتے ہیں: ”سقر: اسم النار الآخرة، من الأرامية Chagar: الإحراق.“ (۳۶۹) (سقر: آخرت کے آگ کا نام ہے جو آرامی زبان میں Chagar ہے جس کے معنی جلانے کے ہیں۔)

سَكْرٌ

قرآن مجید میں ہے: ﴿وَمِن ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ نَتَخِذُونَ مِنْهُ سَكْرًا وَرِزْقًا حَسَنًا﴾ (۳۷۰) (اور کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے بھی، تم ان سے نشہ کی چیزیں بھی بناتے ہو اور کھانے کی اچھی چیزیں بھی۔) اس آیت میں رِزْقًا کے ساتھ حَسَنًا کی صفت لگا کر ضمناً اسی طرف اشارہ کیا جاتا ہے کہ کھجور اور انگور اور اس طرح کی دوسری چیزوں سے نشہ آور چیزیں تیار کرنا ان کا صحیح استعمال نہیں ہے، بلکہ یہ ان چیزوں کا غلط استعمال ہے۔ ان کا صحیح استعمال یہی ہے کہ ان سے پاکیزہ اور صحت بخش غذا حاصل کی جائے جس سے جسم اور عقل دونوں کو توانائی حاصل ہو، نہ کہ ان کو ایسی شکل میں تبدیل کر دیا جائے کہ وہ عقل اور دل کو ماؤف کر دینے والی بن جائیں۔ سیوطی لکھتے ہیں: ”أخرج ابن مردويه من طريق العوفي عن ابن عباس رضي الله عنهما قال: السكر بلسان الحبشية: الخلُّ.“ (۳۷۱) (ابن مردويه نے عوفی کی سند سے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ حبشی زبان میں سکر، سر کہ کو کہا جاتا ہے) ڈاکٹر محمد تونسجی لکھتے ہیں: ”من الأرامية: Chakro أو الخلُّ بالحبشية.“ (۳۷۲) (آرامی زبان کے Chakro سے ہے، یا حبشی زبان سے، جس کے معنی سر کہ کے ہیں۔)

۳۶۸- عبدالرحیم، مرجع سابق، ص ۳۹۵

۳۶۹- ڈاکٹر تونسجی، مرجع سابق، ص ۱۹۹

۳۷۰- النحل: ۶۷

۳۷۱- سیوطی، الإيقان، ج ۱، ص ۱۸۱

۳۷۲- ڈاکٹر تونسجی، مرجع سابق، ص ۱۹۹

سَلْسَبِيلٌ

قرآن مجید میں ہے: ﴿عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّى سَلْسَبِيلًا﴾^(۳۷۳) ((یہ) اس میں ایک چشمہ ہے جو سلسبیل سے موسوم ہے۔) جو الیقینی لکھتے ہیں: ”ہو اسم عجمی نکرۃ، قال الزجاج: هو في اللغة صفة لما كان في غاية السلاسة فكأن العين سميت بصفتها.“^(۳۷۴) (یہ عجمی نام اور نکرہ ہے۔ زجاج کے نزدیک سلسبیل کے معنی روں دواں کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ نام بھی محض اس کی روانی کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔) فخر الدین رازی نے لکھا ہے: ”قال ابن الأعرابي: لم أسمع السلسبيل إلا في القرآن، فعلى هذا لا يُعرف لها اشتقاق، وقال الأثرون: يُقال شرابٌ سلسلٌ وسلسالٌ وسلسبيلٌ أي: عذبٌ سهل المساغ، وقد زيدت الباء في التركيب حتى صارت الكلمة خماسية، و دلّت على غاية السلاسة.“^(۳۷۵) (ابن عربی کہتے ہیں کہ میں نے سلسبیل کو قرآن مجید کے سوا اور کہیں نہیں سنا۔ اس صورت میں اس کے اشتقاق کا پتا نہیں لگایا جاسکتا۔ اکثر حضرات کا خیال ہے کہ شرابٌ سلسلٌ، سلسال اور سلسبیلٌ بولا جاتا ہے، اس میں ترکیب کے اندر ”با“ زائد کر دی گئی ہے جس سے کلمہ، خمساً (پانچ حرفوں والا) ہو گیا ہے اور انتہائی خوش گواری پر دلالت کرتا ہے۔) رازی نے جو کچھ لکھا ہے، صاحب کشف زمخشری کی پیروی میں نقل کیا ہے، جسے الکشاف، ج ۴، ص ۶۷۲ میں پڑھا جاسکتا ہے۔ ابو حیان اندلسی زمخشری کے بیان کو نقل کر کے لکھتے ہیں: ” فإن كان عنى أنه زيدَ حقيقةً فليس بجيدٍ لأن الباء ليست من حروف الزيادة المعهودة في علم النحو وإن عنى أنها حرفٌ جاء في سنح الكلمة وليس في سلسل ولا في سلسال فيصح، ويكون مما اتفق معناه وكان مختلفاً في المادة“^(۳۷۶) (اگر زمخشری کی مراد یہ ہے کہ

۳۷۳- الدهر: ۱۸

۳۷۴- جو الیقینی، المعرب، ص ۳۸۰

۳۷۵- رازی، التفسیر الکبیر، ج ۱۰، ص ۷۵۲

۳۷۶- ابو حیان اندلسی، البحر المحیط، ج ۸، ص ۳۹۸

باء حقیقت میں زائد کر دی گئی تو درست نہیں کیوں کہ علم نحو کے اندر ”ب“ ان حروف میں سے نہیں ہے جو زیادت کے لیے مقرر ہیں اور اگر یہ مطلب ہے کہ حرف باء آثناء کلمہ میں آگیا ہے اور سلسل اور سلسال میں نہیں ہے تو صحیح ہے اور یہ اُن میں سے ہو گا جو کہ معنی میں متفق ہیں اور مادہ میں مختلف ہیں۔)

سَلِيمَانُ عَلَيْهِ السَّلَامُ

انبیاءے بنی اسرائیل میں سیدنا سلیمان عَلَیْهِ السَّلَامُ خاص شوکت و حشمت کے مالک تھے۔ آپ سیدنا داؤد عَلَیْهِ السَّلَامُ کے فرزند اور وارث و جانشین تھے۔ (۳۷۷) آپ کو علم اور قوت فیصلہ کی فراوانی عطا ہوئی تھی۔ (۳۷۸) جو الیقنی لکھتے ہیں: ”سَلِيمَانُ اسْمُ النَّبِيِّ عِبْرَانِي، وَقَدْ تَكَلَّمْتُ بِهِ الْعَرَبُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ قَالَ الْمَعْرِي: وَلَا أَعْلَمُ أَنَّهُمْ سَمُّوْا بِهِ... وَإِنَّمَا سَمِّي النَّاسُ بِهَذَا الْإِسْمِ لَمَّا شَاعَ الْإِسْلَامُ وَنَزَلَ الْقُرْآنُ.“ (۳۷۹)

(سلیمان عَلَیْهِ السَّلَامُ نبی کا نام ہے۔ عبرانی ہے اور عرب کے جاہلیت کے زمانے میں مستعمل ہے۔ معری کہتے ہیں: مجھے نہیں معلوم کہ زمانہ جاہلیت میں کسی کا یہ نام رہا ہو، البتہ جب اسلام کا نور پھیل گیا اور قرآن مجید نازل ہوا تو لوگوں نے یہ نام اپنے بچوں کے لیے رکھنا شروع کیا۔) ڈاکٹر عبدالرحیم نے جفری کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس نام کی اصل عبری میں سلومون، سریانی میں شلیمو یا شلیمون اور یونانی میں سلومون ہے اور بہ ظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ سریانی سے عربی میں آیا ہے۔ (۳۸۰)

سَنَا

قرآن مجید میں ہے: ﴿يَكَادُ سَنَا بَرْقِيهِ يَذْهَبُ بِالْأَبْصَرِ﴾ (۳۸۱) (اس کی بجلی کی کوند، معلوم ہوتا ہے کہ نگاہوں کو اچک لے گی۔ ابن فارس نے لکھا ہے: ”وَأَمَّا الَّذِي يَذُّ عَلَى الرَّفْعَةِ فَالسَّنَاءُ، مَمْدُودٌ،

۳۷۷- النمل: ۱۶

۳۷۸- النمل: ۱۵

۳۷۹- جو الیقنی، المعرب، ص ۳۸۱

۳۸۰- عبدالرحیم، هامش المعرب، ص ۳۸۲

۳۸۱- النور: ۲۳

و كذلك إذا قصرته دَلَّ على الرفعة، إلا أنه مخصوص، وهو الضوء.” (۳۸۲) (سناء (ممدود) بلندی اور ارتفاع پر دلالت کرتا ہے اور سَنَا (مقصود) مخصوص بلندی اور ارتفاع پر یعنی روشنی کی بلندی پر۔) ابن حجر عسقلانی نے ایک نظم کہی ہے جن میں ان الفاظ کو شمار کیا ہے جن کو معرب بتایا گیا ہے، اس میں سَنَا بھی مذکور ہے۔ ”صُرْهُنَّ إِصْرِي وَغِيْضَ الْمَاءِ مَعَ وَزْرِ ثَمَّ الرَّفِيْمِ مَنَاصِ وِ السَّنَا النُّورُ.“ (۳۸۳) مگر سیوطی لکھتے ہیں: ”عَدَّةُ الْحَافِظِ ابْنِ حَجْرٍ فِي نِظْمِهِ وَلَمْ أَقِفْ لِعَيْرِهِ.“ (۳۸۴) (حافظ ابن حجر نے اسے معرب میں شمار کیا ہے، لیکن مجھے نہیں معلوم کہ کسی اور نے بھی ایسا کہا ہو۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: ”وَالكَلِمَةُ حَبْشِيَّةٌ، مَعْنَاهَا: حَسَنٌ.“ (۳۸۵) (حبشی زبان کا کلمہ ہے جس کا معنی حَسَنٌ (نہایت اچھے اور عمدہ) کے ہیں۔)

سُنْدُسٌ

قرآن مجید میں اس کا ذکر تین مقامات پر ہوا ہے: ﴿وَلْيَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ﴾ (۳۸۲) (وہ سندس اور استبرق کی سبز پوشاک پہنیں گے۔) ﴿يَلْبَسُونَ مِنْ سُنْدُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ﴾ (۳۸۷) (وہ سندس اور استبرق کی پوشاک پہنیں گے۔) ﴿عَلَيْهِمْ ثِيَابٌ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ﴾ (۳۸۸) (ان کے اوپر سندس اور سبز اور استبرق کا لباس ہوگا۔) جو الیقینی لکھتے ہیں: ”السُّنْدُسُ: رَقِيْقُ الدِّيَابِجِ، لَمْ يَخْتَلَفْ فِيهِ

۳۸۲- ابن فارس، معجم مقاییس اللغة، باب السين و النون وما يشلتها، ماده: سنح

۳۸۳- عسقلانی، فتح الباری، ج ۸، ص ۲۵۳

۳۸۴- سیوطی، الإتقان، ج ۱، ص ۱۸۱

۳۸۵- ڈاکٹر محمد تونجی، المعرب والدخیل، ص ۱۹۹

۳۸۶- الکھف: ۳۱

۳۸۷- الدخان: ۵۳

۳۸۸- الدهر: ۲۱

المفسرون۔“ (۳۸۹) (باریک دیا کو سندس کہا جاتا ہے، اس میں مفسرین کے مابین کوئی اختلاف نہیں۔) خفاجی بھی اسے معرب ہی مانتے ہیں۔ (۳۹۰) ڈاکٹر عبدالرحیم نے مستشرق Dvork کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ یونانی زبان کے سَنِدْکُس سے معرب ہے۔ (۳۹۱) اور مجتہم یونانی کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ کلمہ آشوری زبان کے Sadu، Samutu سے ماخوذ ہے۔ (۳۹۲) ڈاکٹر محمد تونسجی لکھتے ہیں: ”ضربٌ من الثياب الخضر من رقيق الديداج، فارسية۔“ (۳۹۳) (باریک سبز دیا کا لباس ہے اور فارسی سے معرب ہے۔) سیوطی نے شیدلہ کے حوالے سے لکھا ہے: یہ ہندی زبان کا لفظ ہے۔ (۳۹۴)

سَيِّدَهَا

قرآن مجید میں ہے: ﴿سَيِّدَهَا لَدَا أَلْبَابٍ﴾ (۳۹۵) (اور دونوں نے اُس کے شوہر کو دروازے پر پایا۔ عبدالعزیز بن عبدالسلام سلمیٰ اور سیوطی لکھتے ہیں: ”أَي: زوجها، بلسان القبط.“ (۳۹۶) (یعنی اُس (عورت کا) شوہر۔ قبطی زبان کا لفظ ہے)

سَيِّئِينَ

قرآن مجید میں ہے: ﴿وَطَوَّرَ سَيِّئِينَ﴾ (۳۹۷) (اور طورِ سینین) مولانا حمید الدین فراہی لکھتے ہیں: قرآن نے اس کو ایک جگہ ﴿طَوَّرَ سَيِّئَاءَ﴾ (۳۹۸) بھی کہا ہے، یعنی ایک جگہ وہ مؤنث کی صورت میں ہے

۳۸۹- جو الیقنی، المعرب، ص ۳۶۱

۳۹۰- خفاجی، شفاء الغلیل، ص ۱۷۵

۳۹۱- عبدالرحیم، هامش المعرب، ص ۳۶۱

۳۹۲- عبدالرحیم، نفس سابق، ص ۳۶۲

۳۹۳- ڈاکٹر تونسجی، المعرب والدخیل، ص ۱۹۹

۳۹۴- سیوطی، الإِتقان، ج ۱، ص ۱۸۲

۳۹۵- یوسف: ۲۵

۳۹۶- تفسیر عز بن عبدالسلام، ج ۱، ص ۳۰۰؛ سیوطی، مرجع سابق، ج ۱، ص ۱۸۲

۳۹۷- التین: ۲

۳۹۸- المؤمنون: ۲۰

اور دوسری جگہ جمع سالم کی شکل میں، اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اس کی تانیث اس وجہ سے ہے کہ یہ جمع کی صفت ہے۔ جیسے عربی میں جَمْعًا اور اَجْمَعُونَ مستعمل ہیں۔ تورات میں کہیں سینا آیا ہے، کہیں سینیم، اور معلوم ہے کہ عبرانی میں ”یم“ جمع کی علامت ہے۔^(۳۹۹) ابن جریر عکرمہ کے حوالے سے لکھتے ہیں: ”هو الحسن، وهي لغة الحبشة، يقولون للشبيء الحسن: سيناسينا... وسنين: حسن بالحبشية.“^(۴۰۰) (خوب صورت کے معنوں میں ہے۔ حبشی زبان کا لفظ ہے۔ وہ خوب صورت چیز کو سینا سینا کہتے ہیں۔ سینین بھی حبشی زبان میں خوب صورت ہی کو کہتے ہیں۔) جو الیقی بھی اسے معرب تسلیم کرتے ہیں۔^(۴۰۱) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: عبرانی میں یہ سینا، یونانی میں ”سیناوسینین“ اور سریانی میں طور سینینی ہے۔^(۴۰۲)

سِينَاءَ

قرآن مجید میں ہے: ﴿وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُورِ سَيْنَاءَ تَنْبُتُ بِالذَّهْنِ وَصِبْغٍ لِلْأَكْلِينَ﴾^(۴۰۳) اور (وہ) درخت (بھی اُگایا جو) طور سینا میں پیدا ہوتا ہے، وہ روغن اور کھانے والوں کے لیے سالن کے ساتھ اُگتا ہے۔ سید آلوسی بغدادی لکھتے ہیں:

”والأكثر على أنه ليس بعربي بل هو إما نبطي أو حبشي، و أصل معناه: الحسن أو المبارك، وجوز بعض أن يكون عربيًا من السناء بالمد، وهو الرفعة أو السَّنَا بالقصر وهو النور، وتعقبه أبوحيان بأن المادتين مختلفتان لأن عين السناء أو السَّنَا نونٌ، وعين سنا ياءٌ، ورُدَّ بأن القائل بذلك يقول: إنه فيعالٌ، ويجعل عينه النون و ياء مزيدةٌ وهمزته منقلبةٌ عن واو.“^(۴۰۴)

(اکثر اس پر ہیں کہ سینا عربی نہیں ہے، بلکہ یا تو نبطی ہے یا حبشی اور اس کے اصل معنی ایچھے یا مبارک کے ہیں، بعض اس کا عربی ہونا بھی تجویز کرتے ہیں، یا تو سَنَاءُ بالمد سے جس کے معنی رفعت کے ہیں یا سَنَا بالقصر سے جس کے معنی نور کے

۳۹۹- حمید الدین، مجموعہ تفاسیر فرائی، ص ۳۱۲-۳۱۳

۴۰۰- ابن جریر، تفسیر ابن جریر، ج ۱۲، ص ۶۳۳

۴۰۱- جو الیقی، مرجع سابق، ص ۳۹۲

۴۰۲- عبدالرحیم، مرجع سابق، ص ۳۹۳

۴۰۳- المؤمنون: ۲۰

۴۰۴- الوسی، روح المعانی، ج ۱۷-۱۸، ص ۳۰۵

ہیں۔ ابو حیان نے اس پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ دونوں مادے مختلف ہیں کیوں کہ سَنَاءٌ (مد کے ساتھ) ہو یا سَنَاءٌ (قصر کے ساتھ) دونوں کا عین کلمہ نون ہے اور سَبِيْنَاءٌ کا عین کلمہ یا ہے، مگر یہ اس طرح رد کیا گیا ہے کہ جو اس کا قائل ہے وہ اس کا وزن فیعال بتاتا ہے۔ عین کلمہ نون، یا کو زائد اور ہمزہ کو واو سے تبدیل شدہ قرار دیتا ہے۔

شَطْرٌ

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۚ﴾ (۳۰۵) (تو تم اپنا رخ مسجد حرام کی طرف کرو اور جہاں کہیں تم بھی ہو تو اپنے اسی کی طرف کرو۔) شَطْرٌ کے معنی جہت، جانب اور طرف کے ہیں۔ مسجد حرام سے مراد وہ مسجد محترم ہے جو بیت اللہ کو اس کی ہر جہت سے ہالہ کی طرح اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ قبلہ تو دراصل بیت اللہ ہی ہے، چنانچہ مسجد حرام کے اندر لوگ ہر چہار طرف سے بیت اللہ ہی کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے ہیں، لیکن باہر والوں کے لیے یہ مسجد بھی قبلہ ہی کے حکم میں داخل ہے۔ اسی طرح امت کے لیے قبلہ کے معاملہ میں تھوڑی سی وسعت اور آسانی پیدا کر دی گئی ہے۔ سیوطی نے ابن ابی حاتم کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رُفِج کے حوالے سے بتایا کہ حبشی زبان میں شَطْرٌ کے معنی تَلْقَاءٌ (سمت اور جہت) کے ہیں۔ (۳۰۶)

شَهْرٌ

ابن فارس لکھتے ہیں: ”يُدُلُّ عَلَى وُضُوحِ الْأَمْرِ وَإِضَاطَةِ.“ (۳۰۷) (اس کے بنیادی معنی کسی معاملہ کا واضح ہونا اور روشن ہونا ہوتے ہیں۔) قرآن مجید میں ہے: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ (۳۰۸) (رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر۔) جو البقی نے ثعلب کے حوالے سے لکھا ہے: ”سُمِّيَ شَهْرًا لِّشَهْرَتِهِ وَبَيَانِهِ؛ لِأَنَّ النَّاسَ يَشْهَرُونَ دُخُولَهُ“

۳۰۵- البقرة: ۱۴۴

۳۰۶- سیوطی، مرجع سابق، ج ۱، ص ۱۸۲

۳۰۷- ابن فارس، مصدر سابق، ص ۵۱۸

۳۰۸- البقرة: ۱۸۵

وخر وجہ۔“ (۳۰۹) (مہینے کا نام شہر اس لیے ہوا کہ لوگوں میں اس کے شروع ہونے اور گزر جانے کی شہرت ہوتی ہے۔) جو ایسی لکھتے ہیں: ”بعض اہل لغت کے نزدیک شہر سریانی زبان کے کلمہ سہر کا معرب ہے۔“ (۳۱۰)

صِرَاطٌ

قرآن مجید میں ہے: ﴿أَهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ (۳۱۱) (چلا ہمیں سیدھی راہ۔) ڈاکٹر عبد الرحیم لکھتے ہیں: ”الصِّرَاطُ لاطینی، وأصله (Strata) Via أي: الطريق المبلط۔“ (۳۱۲) (صراط لاطینی زبان کا لفظ ہے، جس کی اصل Strata ہے، جس کے معنی ہموار راستہ کے ہیں۔) ڈاکٹر محمد تونسجی لکھتے ہیں: ”الصراط: الطريق والشارع، والكلمة يونانية من: Strata، استخدمها العرب مجازاً للمنهج، والحق، والوسط۔“ (۳۱۳) (صراط کے معنی شارع اور راستہ کے ہیں۔ یہ یونانی کلمہ Strata سے ہے۔ اہل عرب نے اسے مجازاً منہج، حق اور وسط کے لیے استعمال کیا ہے۔)

صُرْهُنَّ

قرآن مجید میں ہے: ﴿فَخَذَ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ أَجْعَلَ عَلَى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا﴾ (۳۱۴) (آپ چار پرندے لے لیں اور ان کو اپنے سے مانوس کر لیں پھر ان کو ٹکڑے کر کے ہر پہاڑی پر ان کا ایک ایک حصہ رکھ دیں۔) صَوْرٌ کے معنی میلان اور جھکاؤ کے ہیں۔ صُرْتُ الشَّيْءِ يَأْصُرْتُ الشَّيْءِ کے معنی ہوں گے: ”میں نے اس کو اپنی طرف مائل کر لیا، جھکا لیا، اپنے سے اس کو مانوس کر لیا۔ اسی سے فَصُرْهُنَّ ہے، یعنی ان پرندوں کو اپنے سے مانوس کر لو۔“ مفسر ابن جریر لکھتے ہیں: یہ لفظ صار یصور

۳۰۹- جو ایسی، مصدر سابق، ص ۳۱۰

۳۱۰- جو ایسی، مصدر سابق، ص ۳۱۰

۳۱۱- الفاتحة: ۶

۳۱۲- عبد الرحیم، مرجع سابق، ص ۱۵۵

۳۱۳- ڈاکٹر تونسجی، مرجع سابق، ص ۲۰۰

۳۱۴- البقرة: ۲۶۰

اور صَارَ یَصِيرُ دونوں سے پڑھا گیا ہے اور لفظِ مشترک ہے بمعنی: مائل کرنا اور مانوس کرنا اور اور پارہ پارہ اور ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور بعض نے کہا ہے کہ بالکسر بمعنی قطع کرنا اور بالضم بمعنی مائل کرنا اور بعض نے کہا ہے کہ بالضم تو دونوں معنوں میں مشترک ہے اور بالکسر فقط بمعنی قطع کرنا ہے۔^(۴۱۵) اسی لحاظ سے یہ لفظ عربی ہے۔ ابن جریر نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ نبطی زبان سے معرب ہوا ہے جس کے معنی قطع کرنے (یعنی: کاٹ ڈالنے) کے ہیں۔^(۴۱۶) ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: ”ذکر صاحب المغرب أن هذه اللفظة بالسريانية وقيل بالنبطية لكن المنقول أولاً يَدُلُّ على أنها بالعربية.“^(۴۱۷) (صاحب مغرب نے ذکر کیا ہے کہ یہ لفظ سریانی ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ نبطی ہے لیکن سابق میں جو نقل ہوا وہ اس کو بتاتا ہے کہ یہ عربی ہے۔)

صَلَوَاتٌ

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَوْلَا دَفَعُ اللَّهُ النَّاسَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا هَلَدَمَتِ صَوَامِعُ وَيَبِعُ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذَكَّرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا﴾^(۴۱۸) (اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا رہتا تو تمام خانقاہیں، گرجے، کنیسے اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے ڈھائے جا چکے ہوتے۔) مَسَاجِدُ، مَسْجِدُ کی جمع ہے، جو مسلمانوں کی مساجد کے لیے معروف ہے۔ صَوَامِعُ، صَوْمَعَةٌ کی جمع ہے۔ اصلاً یہ لفظ اُن بلند پہاڑوں اور مکانوں کے لیے آتا ہے جہاں عیسائی راہب عبادت کے لیے خلوت اور گوشہ نشینی کی زندگی گزارتے ہیں، اس وجہ سے اس کا ترجمہ خانقاہیں زیادہ موزوں ہے۔ بَيْعٌ، بَيْعَةٌ کی جمع ہے۔ یہ یہود اور نصاریٰ دونوں کے عبادت خانوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، لیکن آگے یہود کے عبادت خانوں کے لیے الگ لفظ آیا ہے، اس لیے اقرب یہ ہے کہ اس سے مراد نصاریٰ کے گرجے ہیں۔ ان کے ہاں رہبانیت کے نظام کی وجہ سے خانقاہوں اور گرجوں دونوں کو یکساں اہمیت حاصل رہی ہے۔ صَلَوَاتٌ، صَلَاةٌ کی جمع ہے۔ یہ لفظ

۴۱۵- ابن جریر، تفسیر ابن جریر، ج ۳، ص ۵۳-۵۵

۴۱۶- ابن جریر، نفس مصدر، ج ۳، ص ۵۵

۴۱۷- عسقلانی، فتح الباری، ج ۸، ص ۲۰۱

۴۱۸- الحج: ۴۰

یہود کے کنیسوں کے لیے آتا ہے۔ عبرانی میں اس کی اصل صَلَوَاتَا ہے۔ جو الیٹی کی یہی راے ہے۔^(۳۱۹) زرخشری لکھتے ہیں: ”سُمِّيَتِ الْكَنِيسَةُ صَلَاةً لِأَنَّهُ يُصَلَّى فِيهَا، وَقِيلَ: هِيَ كَلِمَةٌ مَعْرَبَةٌ، أَصْلُهَا بِالْعِبْرَانِيَةِ صَلَوَاتَا.“^(۳۲۰) (کنیسہ کو صلاۃ اس لیے کہا گیا کہ وہاں بھی عبادت کی جاتی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ کلمہ معرب ہے، جس کی اصل عبرانی میں صلواتا ہے۔)

صَنَم

راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

الصَّنَمُ جُنَّةٌ مُتَّخَذَةٌ مِنْ فِضَّةٍ أَوْ نُحَاسٍ أَوْ خَشَبٍ كَانُوا يَعْبُدُونَهَا مُتَقَرِّبِينَ بِهِ إِلَى اللَّهِ تَعَالَى، وَجَمْعُهُ أَصْنَامٌ... قَالَ بَعْضُ الْحُكَمَاءِ: كُلُّ مَا عُبِدَ مِنْ دُونِ اللَّهِ، بَلْ كُلُّ مَا يُشْغَلُ عَنِ اللَّهِ تَعَالَى يُقَالُ لَهُ صَنَمٌ، وَعَلَى هَذَا الْوَجْهِ قَالَ إِبْرَاهِيمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: وَأَجْنِبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ، فَمَعْلُومٌ أَنَّ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ مَعَ تَحَقُّقِهِ بِمَعْرِفَةِ اللَّهِ تَعَالَى وَاطِّلَاعِهِ عَلَى حِكْمَتِهِ لَمْ يَكُنْ مِنْ يَخَافُ أَنْ يَعُودَ إِلَى عِبَادَةِ تِلْكَ الْجُنُثِ الثِّي كَانُوا يَعْبُدُونَهَا فَكَأَنَّهُ قَالَ: اجْنِبْنِي عَنِ الْأَشْتِغَالِ بِمَا يُضِرُّ فُنِّي عَنكَ.^(۳۲۱)

(الصَّنَمُ کے معنی بت کے ہیں جو چاندی، پتیل یا لکڑی وغیرہ کا بنا ہوا ہو۔ لوگ ان چیزوں کے مجسمے بنا کر ان کی پوجا کرتے تھے اور انہیں تقرب الہی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ صَنَم کی جمع أَصْنَام ہے... بعض حکمانے کہا ہے کہ ہر وہ چیز جسے اللہ تعالیٰ کے سوا پوجا جائے، بلکہ ہر وہ چیز جو انسان کو اللہ تعالیٰ سے بے گانہ بنادے اور اس کی توجہ کو کسی دوسری جانب منعطف کر دے صَنَم کہلاتی ہے۔ چنانچہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ: ﴿وَأَجْنِبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ﴾^(۳۲۲) (مجھے اور میری اولاد کو اس سے محفوظ رکھنا کہ ہم اصنام کی عبادت اختیار کریں۔) تو اس سے مراد ایسی ہی چیزوں کے پیچھے لگ جانا تھا، کیوں کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اس کا اندیشہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اور ان کی اولاد بت پرستی شروع کرے گی۔)

فخر الدین رازی لکھتے ہیں:

۳۱۹- جو الیٹی، مصدر سابق، ص ۳۱۹

۳۲۰- زرخشری، تفسیر الکشاف، ج ۳، ص ۱۶۰

۳۲۱- راغب اصفہانی، المفردات، ص ۲۸۷

۳۲۲- ابراہیم: ۱۴

إنهم وضعوا هذه الأصنام والأوثان على صور أنبيائهم وأكابرهم، وزعموا أنهم متى اشتغلوا بعبادة هذه التماثيل، فإن أولئك الأكابر تكون شفعاء لهم عند الله تعالى، ونظيره في هذا الزمان اشتغال كثير من الخلق بتعظيم قبور الأكابر، على اعتقاد أنهم إذا عظّموا قبورهم فإنهم يكونون شفعاء لهم عند الله تعالى. (۲۲۳)

(ان مشرکوں نے یہ اصنام و اوثان اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی صورتوں پر بنائے تھے اور انھوں نے یہ خیال کیا تھا کہ جب وہ ان کی مورتیوں کی عبادت میں مشغول ہوتے ہیں تو یہ اکابر اور بزرگ ان کے حق میں اللہ تعالیٰ کے ہاں سفارش کرتے ہیں اور اس کی نظیر اس زمانے میں یہ ہے کہ بہت سے لوگ بزرگوں کی قبروں کی اس اعتقاد کے تحت تعظیم کرتے ہیں کہ اس طریقے سے وہ بزرگ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی سفارش کرتے ہیں۔)

خفاجی لکھتے ہیں: ”صنم: معرب شَمَن، وهو الوثن“ (۲۲۴) ”شَمَن کا معرب ہے جس کے معنی بت

کے ہیں۔)

ضَنْكٌ

ارشادِ ربّانی ہے: ﴿ وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَمَحْشَرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَى ﴾ (۲۲۵) (اور جو میری یاد دہانی سے منہ اعراض کرے گا تو اس کے لیے ضیق کی زندگی ہوگی اور قیامت کے دن ہم اُسے اندھا ٹھائیں گے۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: ”الضّيقُ والضّعْف، من الفارسية تنگ.“ (۲۲۶) (تنگی اور ضعف کو کہتے ہیں، فارسی کے ”تنگ“ سے معرب ہے۔)

(جاری ہے)



۲۲۳- رازی، التفسیر الکبیر، ج ۶، ص ۲۲۷

۲۲۴- خفاجی، شفاء الغلیل، ص ۱۹۸

۲۲۵- طہ: ۱۲۴

۲۲۶- ڈاکٹر تونجی، مرجع سابق، ص ۲۰۰